

تسکین الفتن  
فی

# صُلح الحسین

از  
علامہ عدیل اختر طاب ثراه  
سابق پرنسپل مدرسۃ الوداعین لکنؤ



مشائخ کرسدہ  
تنظیم المکاتب، گولہ گنج، لکنؤ، ایو۔ پی (انڈیا)

فون و فیکس: ۲۱۵۱۱۵

## جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

صلح الحسن	نام کتاب :
علامہ عدیل اختر طالب تراہ	مصنف :
جے۔ احمد	کتابت :
نومبر ۱۹۹۳ء	سند طباعت :
۳۰۰۰	تعداد :
تنظیم المکاتب، لکھنؤ (انڈیا)	ناشر :
۲۵:۰۰	قیمت :

### مراکز حصول:

- ۱۔ دفتر تنظیم المکاتب، گورگنج، لکھنؤ ۱۸ (انڈیا)
- ۲۔ جامعہ انوار العلوم، مرزا غالب روڈ، الہ آباد
- ۳۔ جامعہ جوادیہ، پرہاد گھاٹ، بنارس
- ۴۔ مولانا امیر الحسن صاحب قبلہ، A1 نیوشوکت سوسائٹی، ۱۹۔ نوروجی ہل روڈ، ڈونگری بمبئی ۹
- ۵۔ مولانا محمد علی آصف صاحب قبلہ، غازی پور ڈاک خانہ گکوواں، ضلع مظفرنگر
- ۶۔ جناب غلام علی گلزار صاحب، رعناداری حسن آباد، سری نگر، کشمیر

سید علی ہاشمی باری پور جلال پور  
(مختصر رسالہ)

## فہرست

- ۵  
۷  
۱۴  
۱۹  
۲۲  
۲۲  
۲۵  
۲۸  
۳۳  
۳۴  
۳۹  
۴۳  
۴۷  
۵۵
- ۱۔ عرض تنظیم
  - ۲۔ حالات مصنف
  - ۳۔ تصانیف علامہ عدیل اختر
  - ۴۔ صلح کے بارے میں غلط فہمی کا سبب
  - ۵۔ کتاب کے بنیادی اجزا
  - ۶۔ صلح شیعہ کے نزدیک
  - ۷۔ صلح ناقابل اعتراض ہے
  - ۸۔ معاویہ نے زہر دیا
  - ۹۔ علوم ائمہ
  - ۱۰۔ ائمہ کا نظام عمل
  - ۱۱۔ حضور و جناب امیر کی عملی تائید صلح
  - ۱۲۔ مظالم مکہ۔ مگر حضور نے جنگ نہ کی
  - ۱۳۔ صلح حدیبیہ
  - ۱۴۔ فوائد صلح

- ۵۹ ۱۵۔ امیر المؤمنین کی صلح  
 ۷۴ ۱۶۔ اضافت کی غلطی، عقیدہ کی صورت  
 ۹۴ ۱۷۔ علیؑ راہ حق پر  
 ۹۷ ۱۸۔ علیؑ کی فوج کا حال  
 ۱۰۵ ۱۹۔ حالات کا فرق  
 ۱۱۶ ۲۰۔ حضرت علیؑ کی مجبوری  
 ۱۲۹ ۲۱۔ صفین کے متعلق عباسی کی رائے  
 ۱۹۶ ۲۲۔ صلح کے بارے میں صاحب نصاب کا فیہ کی رائے  
 ۲۱۴ ۲۳۔ جہاد و صلح شنی مذہب کی نظر میں
-

## باسمہ سبحانہ عرض تنظیم

صلح حسن علامہ عدیل اختر اعلیٰ الشہ مقامہ کی معرکہ الآراء تصنیف ہے اور اس وقت منظر عام پر آئی تھی جب اردو کا دامن اس طرح کی علمی تصانیف سے خالی تھا۔

یوں بھی اردو میں اس موضوع پر بہت کم لکھا گیا ہے اور جس طرح علامہ مرحوم نے سبط اکبر امام حسن علیہ السلام کی صلح کے واقعہ کو اس وقت کے سیاسی، دینی اور تاریخی پس منظر میں سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے وہ ارباب فکر و دانش کے لئے ان کا ایک علمی عطیہ ہے۔

اس کتاب کی پہلی اشاعت ادارہ تنظیم کے قیام سے صرف ایک دن پہلے بانی تنظیم طالب شاہ نے اپنے ہی قائم کردہ ادارہ مکتبہ افادات عدیل اختر کی طرف سے کی تھی۔ ادھر بہت دنوں سے یہ کتاب کیاب بلکہ نایاب ہو چکی تھی۔ کتاب کی افادیت اور علمی و تحقیقی حیثیت کے پیش نظر بانی تنظیم طالب شاہ نے اس کی دوبارہ اشاعت کا پروگرام بنایا تھا، ساتھ ہی ساتھ کتاب کے عربی متن کی کچھ عبارتیں حذف کر دی تھیں کہ ان کا ترجمہ

کافی ہے۔ بعض جگہ کتاب کی عبارتوں پر نشانات لگائے تھے اندازہ ہے کہ حاشیہ پر تشریحی نوٹ لگانا چاہتے تھے۔ مگر ان کی اچانک رحلت نے اس کام کو التو میں ڈال دیا تھا۔

اب ہم بانی تنظیم کی خواہش کے مطابق کتاب کی اشاعت کی ذمہ داری ادا کر رہے ہیں چونکہ ہمیں نہیں معلوم کہ بانی تنظیم کیا ترمیم کرنا چاہتے تھے اس لئے ہم اصل کتاب شائع کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ صاحبان علم و ادب اب نظر اس سے خاطر خواہ استفادہ فرمائیں گے اور اسلامی تاریخ کے اس عظیم واقعہ کو اس کے صحیح مفہوم میں سمجھنے کی کوشش کریں گے۔

اس خدمت پر ہم بارگاہ الہی میں نذرانہ تشکر پیش کرتے ہوئے مزید توفیقات کے ملتی ہیں۔

والسلام

صفی حیدر

سکرٹری تنظیم المکاتب  
۱۴ اکتوبر ۱۹۶۳ء

## حالاتِ مُصَنَّف

از جناب مولانا آغا مہدی صاحب مرحوم سابق مدیر الوداع

### ولادت

۲۹ ربیع الاول ۱۳۱۵ھ منگل کے دن اپنے وطن علی نگر پالی ضلع گیا میں پیدا ہوئے اور تاریخی نام ”عدیل اختر“ رکھا گیا۔ آپ کا سلسلہ نسب چھبیس واسطوں سے حضرت امام زین العابدین علیہ السلام تک پہنچتا ہے۔

ابتدائی تعلیم مدرسہ سلیمانہ پٹنہ میں مولانا حافظ فرمان علی صاحب مرحوم سے حاصل کر کے مرکز علم و عمل لکھنؤ میں آئے۔ یہ وقت وہ ہے کہ لکھنؤ نئے حال پر بھی اہل کمال سے چھلک رہا ہے۔ فقہ، اصول، منطق و حکمت، ریاضی و فلسفہ، کلام و ادب و معانی بیان کے ماہر موجود ہیں، اور شہر کے ہر گوشہ میں درس و تدریس کا چرچا ہے۔ مشایخ الشرائع مدرسہ ناظمیہ میں مدارج علمیہ کی تکمیل فرمائی اور ممتاز الافاضل کی سند امتیاز خاص کے ساتھ حاصل کی۔ ممتاز الافاضل ہونے سے پہلے آپ الہ آباد یونیورسٹی کے اعلیٰ استاد بھی حاصل کر چکے تھے۔ ناظمیہ مدرسہ میں درجہ فاضل کو ایک مدت تک آپ نے درس دیا اور سرکارِ نجم العلماء نے اس حسن خدمت کے صلے میں جو سند عطا کی اسے مولانا نے اپنے لئے تاجِ عزت قرار دے کر تمام سرکاری اور غیر سرکاری اسناد میں معزز سمجھا۔

۱۹۱۹ء میں مدرسۃ الوداعین قائم ہوا۔ آپ پہلے طالب علم میں جنھوں نے افتتاح کے ساتھ مقاصد مدرسہ کو کامیاب بنایا۔ تین سال کی جدوجہد کے بعد ۱۹۲۱ء میں آپ اپنی جماعت میں سب سے اعلیٰ درجہ میں کامیاب ہو کر مدرسہ کی تعلیم سے فارغ ہوئے اور صوبہ بہار و بنگال آپ کا مرکز تبلیغ قرار پایا۔ جہاں بھی آپ کا تقرر منجانب مدرسہ قرار پایا وہاں کی مقامی زبان حاصل فرمائی۔ چنانچہ بنگال میں بنگلہ زبان حاصل کی۔ کچھ مدت کے بعد یوپی کے مغربی اضلاع میں شدھی کا زور ہوا۔ اس نازک فضا میں جس حسن و خوبی سے آپ نے مدرسہ کے مفاد کو کامیاب بنانے میں خدمات انجام دیں وہ آپ کے مخصوص کا ناموں میں ہیں۔

۱۹۲۲ء میں آپ کو مدرسہ نے جزائر افریقہ میں فریضہ تبلیغ پر مامور کیا۔ قدیم ہندستان کا صوبہ سرحد آپ کی واپسی کا کمال شوق منتظر تھا۔ افریقہ سے واپسی کے بعد ہی باشندگان صوبہ سرحد کی دعوت پر مدرسہ نے مولانا کا مرکز تبلیغ پشاور مقرر کیا۔ یہاں کے زمانہ اقامت میں مدرسہ نے کچھ مدت کے لئے تربت کے دور افتادہ علاقہ میں آپ کو مامور کیا اور آپ وہاں گئے اور باشندگان تربت کو اپنی مذہبی خدمات سے جس طرح مطمئن فرمایا وہ ایک مفید اور دلچسپ تبلیغی شاہکار ہے جس کی روداد رسالہ 'الواعظ' کے صفحات میں موجود ہے۔ فرقہ نواز خشیدہ کے خیالات کو صحیح مرکز پر قائم کرنا اور دہنان جماعت کے غلط اصول کو شکست دینا آپ کے تجربہ اور تدبیر کی بہترین مثال ہے۔

یہاں سے واپسی کے بعد آپ اپنے مرکز تبلیغ صوبہ سرحد تشریف لائے اور ۱۹۲۶ء سے ۱۹۳۶ء تک کا زمانہ آپ نے اس نامہوار زمین کے ہموار کرنے میں صرف فرمایا۔ جون ۱۹۳۶ء میں آپ کا تقرر بحیثیت وائس پرنسپل مدرسۃ الوداعین ہوا۔ اہل پشاور مولانا کے لکھنؤ آنے پر کسی طرح رضامند نہ تھے مگر حضرت نجم العلماء کے فرمان سے سپرانداختہ

ہو کر رخصت کیا۔

آپ نے درس و تدریس کے نظام میں جدید اصلاحات پیش کئے اور اپنے تجربات کی بنا پر نصاب تعلیم تبدیل کر کے لباس نو پہنایا اس عہدہ پر خدمت کو ایک ہی سال ہوا تھا کہ پرنسپل صاحب نے انتقال فرمایا اور ارباب حل و عقد نے آپ کے خدمات کی قدر دانی فرما کر پرنسپل کے عہدہ پر مقرر کیا۔ مولانا کا انتخاب عہدہ پر پرنسپل پر ہونے کا اعلان ہوتے ہی پراونشل شیڈ کانفرنس صوبہ سرحد راجن امامیہ بنگلش اسٹریڈنی صوبہ کو ہاٹ اور دیگر اداروں نے مدرسہ کو اپنے بیانات تبریک سے مطلع کیا جو اواعظا یکم جولائی ۱۹۳۶ء میں موجود ہیں۔

۱۹۳۶ء سے تا انتقال آپ حضرات واعظین کی تعلیم و تربیت فرماتے تھے۔ آپ کے صفات پر مختصر روشنی ڈالنے کے لئے اخبار "سیراز" مورخہ ۲۱ فروری ۱۹۳۶ء کے ایک طویل مضمون کا ایک حصہ درج ذیل ہے:

”آپ سب سے پہلے طالب علم میں جنھوں نے مدرسہ میں جماعت میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کئے اور آج تک مدرسہ کی تحریری و تقریری امتحان انجام دیتے رہے۔ اخبار کا مطالعہ کرنے والے اور مدرسہ واعظین کے تبلیغی خدمات سے دلچسپی رکھنے والے اس سے بخوبی واقف ہیں کہ موصوف نے ہندوستان کے علاوہ افریقہ اور تبت میں بھی تبلیغی خدمات انجام دی ہیں۔ موصوف اردو، فارسی و عربی کے ماہر ہونے کے علاوہ انگریزی، گجراتی، پشتو، پنجابی اور سواحلی زبانوں میں بقدر ضرورت تحریر و تقریر فرما سکتے ہیں۔ موصوف نے مذاہب غیر کا غیر معمولی مطالعہ کیا ہے اور اس کے متعلق مفید و دلچسپ مضامین بھی شائع کرتے رہے ہیں۔ آپ ہندی میں بھی واقفیت

رکھتے ہیں اور آسانی لکھ پڑھ سکتے ہیں۔ فی زمانہ جو طرز تبلیغ اقوام عالم کا ہے  
آپ اس سے بھی باخبر ہیں۔“

ظاہر داری اور نام و نمود سے آپ کو قطعی نفرت تھی۔ وسعت مطالعہ کا حال مدرسہ  
واعظین کے عظیم الشان کتب خانہ کی سیر سے دریافت ہو سکتا ہے۔ بکثرت وہ کتابیں ہیں  
جن پر عربی میں حواشی موجود ہیں۔ یہ علمی نوٹس جب تک کتب خانہ قائم ہے مرحوم کے  
باقیات الصالحات میں ہیں۔ ممدوح نے اپنی عمر میں جتنی قومی تحریکیں ہوئیں ان کو کامیاب  
بنایا۔ محاذ حسینی اور تبرائیجی ٹیشن میں آپ ہی کے قلم کی گردش کا اثر تھا جو اسیری کے لئے  
پشاور اور پنجاب آئندہ آیا۔ وہ منظر عام پر آنے کے عادی نہ تھے۔ جس مقصد کو صحیح سمجھتے  
تھے، اس کو مدد پہنچانے میں بلا تحریک مصروف ہو جاتے تھے۔ عشرہ اور جہلم کے دن اگر  
لکھنؤ میں قیام ہوا تو صرف ایک کالا کڑتا پہن کر اور سرد پارہ بن کر بلا تشریف لے جاتے تھے۔  
مشاہد مقدسہ کی زیارت سے بھی خداوند عالم نے دو بار ۱۹۲۵ء اور ۱۹۳۹ء میں مشرف کیا  
اور آپ کو علامہ بروجری مظاہر کی وکالت کا بھی اعزاز حاصل تھا۔

استقال سے دو سال پہلے زیارت حرمین کا بھی شرف حاصل ہوا اور حج بیت اللہ  
کی زیارت ہوائی جہاز سے کی۔ اس سفر کے دلچسپ و تاریخی حالات استقلال لکھنؤ  
کی متعدد اشاعتوں میں طبع ہو چکے ہیں۔ جو آپ کی تالیف کی حیثیت ہے۔

## تقاریر

ذیلے شیعیت کا چہ چہ آپ کے مواعظ اور تقریروں سے واقف ہے۔ لکھنؤ  
کانپور، الہ آباد، آگرہ، فیض آباد، اعظم گڑھ، بنارس، مرشد آباد، کلکتہ، رنگون، مراد آباد،

منظر نگر، دہلی، کاٹھیاوار، لاہور، ملتان، راولپنڈی، پشاور، مدراس، ویلور، بنگلور، مسقط، مدغاسکر، زنجبار، کشمیر، جتوں، اسکردو، لداخ، تبت وغیرہ میں معرکہ آرا تقریریں فرمائیں۔ عشرت رحمانی صاحب ریڈیو اسسٹنٹ کے زمانہ میں ماہ محرم اور دیگر مواقع پر آل انڈیا ریڈیو سے بھی آپ کی تقریریں نشر ہوئی ہیں۔

## اعزازِ مملکتی

مولانا نے محرم کا چونکہ اُس خاندان سے تعلق تھا جس کے سرسلطان احمد کے سی۔ ایس۔ آئی علی اکبر کاظمی پرنسپل ٹریننگ کالج پٹنہ، موسیٰ رضا صاحب کاظمی ٹیکسٹائل کمشنر آف انڈیا وغیرہ مشہور ہستیاں محتاج تعارف نہیں ہیں۔ اس لئے سول و ملٹری حکام آپ کی خاص عزت کرتے تھے۔ اپریل ۱۹۴۶ء میں جب آپ دہلی میں سرسلطان بالقابہ کے مہمان تھے اور دہلی کی اسلامی کانفرنس میں شرکت کے لئے تشریف لے گئے تھے تو مولانا ابوالکلام آزاد نے سابق کے رواسم کی بنا پر آپ کو اپنے یہاں دعوت دی اور اپنے تصانیف مطالعہ کے لئے دیئے۔

ہراکسینسی سرورجی ہائیڈوگورزیو۔ پی نے آپ کو کئی مرتبہ گورنمنٹ ہاؤس میں باریاب کیا اور سیاست حاضرہ میں حصہ لینے کی خواہش ظاہر کی۔ لیکن اس علم نواز گوشہ نشین ہستی نے اپنے حدود و عمل سے تجاوز نہ کیا۔

پشاور کے دوران قیام میں سرحد کے گورنر مسٹر کنگھم سے کئی بار ملاقات ہوئی اور اختلاف خیال میں آپ اپنی رائے پر سختی سے قائم رہے اور اتنی خاندانی عزتوں کے باوجود فقیرانہ زندگی بسر کی۔ ناکافی اور قلیل مشاہرہ پر شکر منعم اور فراغ کی ادائیگی میں دولہ اُن

کی خاص صفت تھی۔ مال و دولت کی کبھی ہوس نہیں کی اور ایسے ذرائع کے قریب نہیں گئے۔

## اخلاق

عام لوگوں کے ساتھ آپ کا خلق و مردت اس قدر قابل ذکر ہے کہ جو ایک مرتبہ آپ سے ملتا تھا اس کے دل میں آپ کی یاد ہمیشہ تازہ رہتی تھی۔ غیر شیوخ حضرات کے ساتھ آپ کے خلق ہی کا نتیجہ تھا کہ پشاور اور مضافات پشاور کے اہل سنت بھی آتی ہی قدر و منزلت سے دیکھتے تھے جتنا شیعوں میں مقبول تھے۔

اپنے ہم درس (کلاس فیلو) افراد کے ساتھ آپ بہت ہی سادگی اور غیر معمولی عزت کے ساتھ پیش آتے تھے۔ مدرسہ سلیمانہ کے ہم سبق طلباء میں نواب زادہ محمد مہدی صاحب ایم۔ ایل۔ سی، نواب علی سجاد صاحب، علی اکبر صاحب کاظمی اور مدرسہ ناطیہ کے اہل علم و کمال میں مولانا سید محمد عمید صاحب قبلہ و حافظ کفایت حسین صاحب مولانا سید خورشید حسن صاحب قبلہ، حضرت قیس زنگی پوری کی خاص عزت کرتے تھے۔

## قبول مذہب حق

مولانا نے مرحوم کے تبلیغی کارناموں پر نظر کرنے سے وہ اسما پیش کیے جاسکتے ہیں جنہوں نے آپ کے روبرو مذہب حق اختیار کیا۔ ضیق وقت میں ہم تفصیل سے قاصر ہیں۔ اور جارج سالون کا نام بتا کر اس مقالہ کو ختم کرتے ہیں۔ موصوف نے ۲۵ جنوری ۱۹۳۸ء کو عیسائیت سے تائب ہو کر حقانیت اسلام کا اقرار کیا اور اسلامی نام محمد جعفر

تجویز ہوا۔ (ملاحظہ ہو 'الواعظ' فروری ۱۹۲۶ء)

## وفات حسرت آیات

۷ شوال بروز جمعہ مطابق ۱۳ جولائی صبح کی نماز اور تعقیبات سے فراغت کے بعد سر میں درد کی شدت ہوئی، آرام کے لئے لیٹ گئے۔ پانچ بجے صبح کو کمزوری قلب نے حالت مزاج میں زیادہ تغیر پیدا کر دیا۔ انکے شدید تپ اور غشی شروع ہوئی۔ افسوس ہے کہ یہ آفتاب علم و کمال ۸ شوال ۱۳۵۷ھ کو ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔ مرحوم نے پچپن سال کی عمر میں صرف ایک نوجوان صاحبزادہ سید ناصر حسین فخر الافرغی نے۔ خداوند عالم زیور صلاح و سداد سے آراستہ کرے۔ (الواعظ جولائی و اگست ۱۹۵۱ء)

# تصانیف علامہ عدیل اختر

از جناب مولانا شیخ محمد حیدر صاحب واعظ مرحوم

## ۱۔ دعوتہ النظر الی اخلاقہ خیر البشر

یہ کتاب استاد مرحوم نے مقام مجنگا، ماسکو (افریقہ) سے واپس آ کر ہیالت قیام پشاور اور صوبہ سرحد ماہ جون ۱۹۲۶ء میں تالیف کی تھی۔ مرحوم نے شروع کتاب میں مشہور و مسلم کتب حضرات اہل سنت کے نام اور ان کے مصنفین کے اسماء مع سنہ ولادت و وفات تحریر فرمادیئے ہیں۔ نیز سنین طباعت و مطابع کو بھی ظاہر کر دیا ہے۔ جن کتابوں کے حوالے دیئے گئے ہیں ان کی شہرت علمی دنیا میں عام ہے۔

دوران تحریر جن کتابوں سے حوالہ جات دیئے ہیں ان کے صفحات اور سطور بھی بحسنہ نقل کر دیئے ہیں تاکہ کسی انصاف پسند حق میں اور غیر جانب دار ناظر کو تباسش ماخذ میں زحمت و وقت اور سراسیمگی و بے اطمینانی نہ ہو۔ یہ کتاب تقریباً ایک سو آٹھ صفحات پر مشتمل ہے۔ جس میں استاد مرحوم نے مختلف علوم کی روشنی میں بحث امامت و خلافت پر بے نظیر کتاب لکھی ہے۔

## ۲۔ اَلْاٰمِنُ اَكْرَهُ وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْاِيْمَانِ

یہ کتاب موضوع تقیہ پر لکھی گئی ہے۔ حاشیہ پر تحریر ہے کہ اصل رسالہ ۱۹۵۲ء میں لکھا گیا۔ بزمان قیام اگرہ تبرکاً شہید ثالثؒ کی روح سے استمداد کی غرض سے مزار مقدس کے متصل بیٹھ کر مسودہ نقل کیا جا رہا ہے لہذا انھیں کے نام پر معنون کیا جا رہا ہے۔ ضمیمہ میں مصنفؒ نے ان حضرات سے جو مذہبی مسائل میں راہِ صداقت و حقی کے جویاں ہیں اُن سے خاص طور سے اپیل کی ہے کہ میری کتاب کو بغیر کسی جانب داری کے برائصاف از اول تا آخر دیکھا جائے انشاء اللہ پوری تسکین کا باعث ہوگی۔

### سریصلہ و تاریخ احمدی (مصنفہ جناب احمد حسین خان صاحب مرحوم پر یا نواں)

نواب صاحب مرحوم نے تاریخ احمدی لکھ کر ایک بہت بڑا سرمایہ تاریخ قوم کے سپرد فرمایا تھا۔ جن کو ملک کے ہر گوشہ میں قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھا گیا مختلف موضوعات پر کتب اہل سنت و الجماعت سے عباراتیں بجنسہ حاشیہ پر منقول ہیں مگر کتاب میں حوالے نہیں ہیں۔ علامہ عدیل اخترؒ نے اضافہ فرما کر کتاب کے استحکام میں بے حد کد کاوش سے کام لیا ہے اور صحیح معنوں میں تاریخ احمدی کے متعلق قوم کی اہم ضرورت کو پورا کر دیا۔ چنانچہ استاد مرحوم نے دیا چہ میں تحریر فرمایا ہے:

”تاریخ احمدی مولفہ جناب شیخ احمد حسین صاحب اپنی خوبیوں کے سبب اس قدر جلد مشہور اور اتنی زیادہ مقبول ہوئی کہ مصنف کی زندگی ہی میں بارہ بارہ چھپ کر تشنگان حقائق و طالبان واقعات واقعی کو تشنگی دور کرنے

اور اصلیت پر پردہ ڈالنے والوں کی ظلمت کو کافور کرنے میں مسیحائی کا کام  
 کر گئی..... میں نے اضافوں کو اصل کتاب میں مخلوط نہیں کیا تاکہ مصنف  
 کی محنت نمایاں رہے..... وہ سب اضافے بطور ”صلواتاً تارخ احمدی“  
 مناسب مقام کے ساتھ حوالوں کے صفحات کے ہمراہ لکھے اور کچھ بالکل آخر میں  
 بغرض افادہ بڑھادیئے۔“

(عدیل اختر، مدرسۃ الواعظین لکھنؤ۔ ۳۱ مارچ ۱۹۴۹ء)

### ۴۔ فلسفہ اسلام یا علم کلام

یہ کتاب معضیمہ تقریباً تین سو صفحات پر مشتمل ہے۔ موضوع خود عنوان کتاب سے ظاہر  
 ہے۔ کافی جہد و جدوجہد و تلاش کے باوجود کتاب کے اول و آخر میں کہیں زمانہ تصنیف کا  
 پتہ نہیں چلتا۔

### ۵۔ اصحاب الیمین، اصحاب الشمال، اصحاب الشمال

یہ کتاب علم رجال میں مرحوم نے نہایت سلیس اور آسان طرز پر لکھی ہے۔  
 اور مختلف مقامات پر حرج و تعدیل کے طریقوں سے روشناس کرایا ہے۔ ماہرین  
 و شائقین فن رجال کے لئے ایک نادر و گراں بہا سرمایہ علمی چھوڑا ہے۔ زیر نظر کتاب  
 کے آخر میں استاد مرحوم نے مدوح اصحاب رسولؐ میں بعض حضرات کے حالات معتبر کتابوں  
 سے تحریر فرمادیئے ہیں۔ یہ کتاب ۳ ذی الحجہ ۱۳۶۵ھ مطابق ۷ اکتوبر ۱۹۴۹ء لکھی گئی  
 اور تقریباً تین سو صفحات پر مشتمل ہے۔

## ۱۔ تیسری شبلی

استادِ علام نے تاریخ یا مناظرہ میں ایسی یادگار چھوڑی ہے جس کے متعلق وہ خود فرمایا کرتے تھے کہ: ”میں نے مولانا شبلی نعمانی کی تالیف کو بخوبی دیکھ کر ایسا جواب دیا ہے کہ جس پر تمام اربابِ انصاف کو سر تسلیم خم کرنا پڑے گا۔ یہ کتاب بہت مختصر ہونے کے باوجود بھی بڑی گرانمایہ اور مایہ ناز تحقیقِ علمی کا پنچوڑ ہے۔ جو مرحوم کا عصرِ حاضر میں طرہ امتیاز تھا۔ یہ کتاب ۱۹۴۶ء کی تصنیف ہے۔ یہ کتاب چھپ چکی ہے۔“

## ۲۔ علمی خیانتیں

یہ کتاب کسی فن سے متعلق نہیں بلکہ خود مستقل بالذات یہ ایک فن ہے جس پر اب تک کسی نے قلم نہیں اٹھایا تھا خود مرحوم کو اپنی یہ تصنیف محبوب تھی۔ واقفانہوں نے اس گرانمایہ اور اہم فریضہ سے دیگر علمائے اسلام کو ان کی ذمہ داری سے سبکدوش کر دیا ہے مصنف نے آخر میں مقصد کتاب کی وضاحت اس طرح کی ہے:

”اس کتاب کا مقصد یہ ہے کہ جن حضرات کے پاس اس وقت اصلی کتابیں موجود ہیں ان کی خصوصی حفاظت کریں۔ جن کے پاس نہیں ہیں وہ جب حاصل کریں تو کوشش کر کے وہ نسخے حاصل کریں جو غیر محرت ہیں اور آئندہ نسلوں کے پاس یہ سدر ہے کہ کتابوں میں اس طرح ”علمی خیانت“ کی گئی ہے۔“

## ۸۔ تسکین الفتن فی صلح الحسن

امام حسن علیہ السلام کی معتبر اور مدلل تاریخ ہے۔ سرسری طور پر میں نے بھی اس کتاب کو دیکھا ہے اور مرحوم کے وہ الفاظ بھی اب تک کانوں میں گونجتے ہیں جب کہ فرماتے تھے: ”امام حسنؑ کے واقعات بھی واقفہ کر بلا سے کچھ کم نہیں تھے۔“

## قطعات تازخ و فات مُصنّف

مرتبہ جناب مولانا سید ناصر حسین صاحب زیدی پٹنہ

فارسی

- ۱۔ سال فوتش بر معجزہ گفتم  
شد مکین ارم عدیل اختر  
۱۲۷۰ھ
- جناب مولانا سید رحیم صاحب قبلہ نکہت مرحوم
- ۲۔ چون دلم سال رحلتش پرسید  
گفت ہاتف عدیل اختر و او  
۱۲۷۰ھ
- جناب مولانا عبدالحسن صاحب قبلہ مرحوم
- ۳۔ جہذا بخت کہ معبود بر نفسش فرمود  
و ادخل جنتی پاکیزہ زبان بندہ مومن  
جناب سید میر علی مرحوم
- ۴۔ برائے سال مسیحی و ہجریش زار  
بگو، یگانہ معصوم شد عدیل اختر  
۱۹۵۱ء
- جناب زار سیتا پوری مرحوم

اردو

- ۵۔ اختر بے عدیل ڈوب گیا  
جناب مہذب لکھنوی مرحوم
- ۶۔ اے حسن عمل کی باد صبا  
جنت کے مسافر کیا کہنا  
جناب زار سیتا پوری مرحوم

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

## صلح کے بائے میں غلط فہمی کا سبب

الحمد لله رب العالمين والصلوة والسلام على خير خلقه  
اجمعين وعلى عترته وذريته المعصومين ولعنة الله على  
اعدائهم المكذابين الضالين من يومنا هذا الى يوم الدين -

واضح ہو کہ غیر مسلم تو ناواقف ہی ہیں خود مسلمانوں کو بھی اکثر اسلامی حالات واقعات اور ان کے علل و اسباب سے لاعلمی کے سبب اس قسم کے شبہات پیدا ہو جاتے ہیں، جو نہ صرف ذہانت کی تیزی اور حوادث پر طبع آزمائی تک محدود رہتے ہیں بلکہ ان کے اثرات نہایت دور جا پہنچتے ہیں اور اگر ان کو دور نہ کیا جائے تو بسا اوقات اتفاقی و اجماعی عقائد سے باہر ہو جانے کا سبب بن جاتے ہیں جو نہایت درجہ افسوس ناک ہے۔ عقل کا تقاضہ یہ ہے کہ واقعات پر رائے زنی سے پہلے غیر جانب دار ہو کر تمام پہلوؤں پر غور کر لیا جائے، عقل و نقل کے معیار پر جانچ لیا جائے، دلیلوں کی کسوٹی پر کس لیا جائے پھر کوئی رائے قائم کی جائے۔ جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دونوں جگر گوشوں دحسن

وحین علیہما السلام، کی زندگی اور ان کے تمام حرکات و سکنات اس اجمال کی تفصیل کہے جانے کے مستحق ہیں جو ذات سرور عالم میں پیچیدہ اور آپ سے وابستہ تھے (اور بنظر معان دیکھنے والوں کے نزدیک یہ نہایت واضح بھی ہے) لیکن ظاہر بینی اور غیر ملک و ملت کے اہل قلم کی نکتہ آفرینی کا براہو کہ بے سوچے سمجھے سادہ لوح اور ناواقف یا متعصب اور خود غرض لوگوں میں یہ زہر پھیل گیا کہ امام حسن علیہ السلام کی صلح نازیبا تھی یا خلافت عقل و شرع تھی اور اس سے ان غیر منطقی نتائج کو چپکادیا گیا جو کسی طرح میزان عقل میں کوئی وزن ہی نہیں رکھتے۔ اس طرح امام مسوم کی ذات پر نہایت عامیانہ و جاہلانہ اعتراض کے تیر بار اں کر دیے گئے۔

واقعات پر سرسری نظر ڈالنے اور اس کی اصلی غرض و غایت اور اس کے واقعی اور گہرے نتائج سے غافل رہنے کے سبب اسلامی دائرہ سے باہر رہنے والی دنیا کے علاوہ حلقہ بگوشان اسلام بھی بہت کچھ اس عظیم الشان قربانی کی جلالت و عظمت کے تصور میں غلط فہمی کا شکار بن گئے ہیں جو سلسلہ میں بہت کام کر بلا اپنی فقید المثال صورت سے مظلوم کر بلا نے پیش فرمائی ہے۔

اس رسالہ میں میں نے چاہا ہے کہ صلح امام حسن علیہ السلام کے مسئلہ پر روشنی ڈال کر بتلاؤں کہ آپ کے تمام اقدامات خواہ کسی صورت کے ہوں بالکل اسی طرح واجب الاحترام ہیں اور مطابق عقل و شرع ہیں اور ایسے ہی عظیم الشان نتائج اپنے پہلوؤں میں لیے ہوئے ہیں جس طرح جناب سید الشہداء علیہ الصلوٰۃ والسلام کے تمام اعمال و افعال میزان عقل و شرع میں نہایت موزوں و قابل تائیس

ہیں اور ان کا گہرا نقش اور دور رس نتیجہ رہتی دنیا تک ناقابلِ محو و سہو رہے گا۔ کسی مسلمان بلکہ کسی باعقل کو واقعات اور حالات کی پوری اطلاع اور جانچ کیے بغیر لئے قائم کر لینا اور اس میں تعجیل سے کام لینا ناروا اور غلط ہے۔

یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ اس مسئلہ (صلح امام حسن) میں ایک خاص پیچیدگی اس لیے پیدا ہو گئی ہے کہ امامت و نبوت کے ساتھ جمع ہونے والی حکومت اور دنیاوی سلاطین کی سلطنت کے معنی اور مقصد میں خلط بحث کر دیا جاتا ہے اور ایک مسئلہ سیاست کا درمیان میں آجاتا ہے اور چونکہ دنیاوی حکومت کی سیاست ہی عام انسانوں کی آنکھوں کو خیرہ کیے ہوئے ہے اکثر لوگوں کو نبوت اور امامت کی حکومت میں بھی انہیں سطوت و جبروت کی چنگاریوں کی تلاش ہوتی ہے جو خرمین صلح و انصاف کو اندر ہی اندر سلگاتی رہتی ہیں اور جب بھڑک اٹھتی ہیں تو اپنے انہیں شعلوں سے اپنا کام بھی تمام کر دیتی ہیں۔

اگر امام حسن، امیر المومنین اور سرورِ دو جہاں کی صلح کے متعلق کوئی دنیاوی سیاست کا ماہر قلم اٹھاتا تو غالباً وہ زیادہ لکھ سکتا مگر مشکل یہ ہے کہ ایسے حضرات تو ہمہ تن عام رجحانات ہی کی خوبیوں پر نظر استھان ڈالتے ہیں اور ظاہر ہے کہ عوام کی نظر اور ان کا رجحان طبع نقد اور فانی لذتوں کو ترک کر کے نسیہ اور دائمی محاسن کا شیدائے آسان نہیں۔

اس موضوع پر میں اس نقشِ اول کو اس لیے پیش کر رہا ہوں کہ ممکن ہے کہ اس ناچیز تحریر کے بعد کسی اور صاحبِ قلم کو اس امر کی طرف توجہ ہو جائے اور وہ اس سے بہتر لکھ سکے، یا احباب و ارباب علم حضرات کا نقد و تبصرہ دوبارہ اس کی

خامیوں کو درست کرادے۔ واللہ المستعان

## کتاب کے بنیادی اجزاء

اس رسالہ کے دراصل تین جزو ہیں:  
 پہلا ان لوگوں کی تسکین اور تشفی کے لیے جو اپنے آپ کو شیعہ کہتے ہیں۔  
 دوسرا ان لوگوں کی غلط فہمی دور کرنے کے لیے جو غیر شیعہ مگر مسلمان ہیں۔  
 تیسرا ان صاحبانِ انصاف و عقل کے غور کے لیے جو غیر مسلمان ہیں۔  
 اسی ترتیب سے اولاً پہلا جزو لکھتا ہوں اس کا تعلق صرف شیعہ حضرات سے

ہے۔

## صلح امام حسنؑ شیعہ کے نزدیک

رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا اعلان نبوت فرمانا تھا کہ سائے حجاز  
 بلکہ روئے زمین یا یوں کہئے کہ کل کائنات میں ایک نمایاں انقلاب پیدا ہو گیا۔  
 آپ کی تیس سال کی زندگی کچھ ایسے انداز سے گزری کہ تاریخ اس کی نظیر پیش  
 کرنے سے قاصر ہے۔ ابتدائے خلقت سے جن لوگوں پر نظر پڑتی ہے آج تک  
 کوئی نبی یا سلطان اتنی مدت اور ایسے ماحول و حالات میں اس طرح اپنے مشن  
 کو اتنا کامیاب نہ بنا سکا اور لطیفہ یہ کہ قیامت تک کے لیے اس میں ایسا استحکام  
 و قرار پیدا کر دیا جس کی کوئی مثال ہی نظر نہیں آتی۔ آپ کے حالات زندگی آپ کے

کلمات اور فرمائشات آپ کے بتائے ہوئے طریقے اور آپ کے مقررہ کردہ پیشوا  
 ایسے نہیں کہ جن کی مثال تاریخ عالم میں مل سکے۔ گزشتہ حالات کے سچے اور ضروری  
 اطلاعات آئندہ حوادث کے متعلق بہترین رہنمائی و پیشین گوئی ایسی مکمل و مصدق  
 کہ نہ سرمو فرق، نہ ریب و شک کی گنجائش، نہ ذرہ برابر گمراہی و ضلالت کا خطرہ۔  
 ان حالات پر نظر ڈالنے والا اگر انصاف کی نظر سے آپ کے بارہ معصوم جانشینوں  
 کے اعمال و افعال، ان کے سوانح حیات کا مطالعہ کرے تو کسی کے متعلق حرف گیری  
 کا ہرگز موقع نہیں پاسکتا۔ چونکہ اس رسالہ میں صرف امام حسن علیہ السلام کی صلح پر  
 بحث کرنا ہے لہذا دیگر حضرات کے حالات کی تفصیل نہیں کی جائے گی۔

کسی شخص کی ذات یا اس کے اعمال و افعال پر بحث کرنے سے پہلے اس کی  
 حیثیت و حالات کا سمجھ لینا نہایت ضروری ہوتا ہے۔ امام حسن علیہ السلام کی صلح جو  
 زیر بحث ہے تین حیثیتوں سے دیکھی جاسکتی ہے :

۱۔ شیعہ نقطہ نگاہ سے کیونکہ آپ شیعوں کے نزدیک بارہ اماموں میں سے  
 دوسرے امام معصوم اور منصوص و مفترض الطاعتہ ہیں۔

۲۔ اہل سنت کے خیال سے، اس لیے کہ اگر آپ کو اُس طرح امام نہ بھی مانیں  
 جس طرح شیعہ کہتے ہیں پھر بھی آپ کی امامت ایک حد تک وہاں بھی مسلم ہے۔ اس  
 کے علاوہ بہر حال آپ واجب الاحترام مسلمان، صحابی، سید شباب اہل البیت اور  
 فرزند دریمان رسولؐ ہیں۔

۳۔ عام انسانی خیال سے، اس لیے کہ آپ عالی خاندان مسلمان ہیں۔ بانی اسلام  
 کے نواسے ہیں۔ حضرت علیؑ جو بقول شیعہ پہلے اور بقول اہل سنت چوتھے خلیفہ

تھے ان کے فرزند ہیں، جیسی کچھ سہی اور جتنے دنوں کی سہی آپ کو خلافت و حکومت ملی ہے اس لیے حاکم اور سردار فوج ہونے کی حیثیت کے مالک ہیں۔

تاریخ و حدیث کا مطالعہ صاف بتلاتا ہے کہ امام علیہ السلام کی صلح تینوں مذکورہ بالا حیثیت سے انتہائی دانشمندی تھی اور ایسا حکیمانہ فعل تھا جس کی خوبیاں نہ صرف آپ کی حیات تک محدود رہیں بلکہ اس مشن کو پوری طرح محکم کرنے کا ذریعہ تھی جس کا اعلان بعثت لائمم مکارم الاخلاق اور هو الذی بعث فی الامین رسولاً منهم یتلووا علیہم آیاتہ ویزکیہم ویعلمہم الکتاب والحکمۃ وان کانوا من قبل لفی ضلل مبین (جمعہ) اور الذین یتبعون الرسول النبی الامی الذی یجدونہ مکتوباً عندهم فی التورۃ والانجیل یا امرہم بالمعروف وینہہم عن المنکر ویحل لہم الطیبات ویحرم علیہم الخبائث ویضع عنہم اصرہم والاعلال التی کانت علیہم۔ (پ، ۹۷) وغیرہ کے ذریعہ ہو چکا تھا جن میں سردار عالم کے آنے کے مقصد کو صاف صاف واضح کر دیا گیا تھا۔ بلکہ صلح حسن نے دراصل امام حسینؑ کی آنے والی قربانی اور ذبح عظیم کی گہری تاثیر کی داغ بیل ڈالی تھی۔ چنانچہ جب اس شہادت عظمیٰ کا ٹھیک ٹھیک وقت آگیا اور حسینؑ نے بڑی آن بان سے اس امتحان میں کامیابی حاصل کر لی تو اس درخت میں ٹہرایا جو حسنؑ نے لگایا تھا اور اسلام کے بھیس میں اسلام کشی کا جو بھوت ڈھانکا اور جو بت تراشا گیا تھا اس کا پردہ چاک ہو گیا، آنکھوں والوں پر روشن ہو گیا کہ محمد و ذریت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیا چاہتے تھے اور سلطنتوں کا بہاؤ کس طرف تھا۔

امام حسن علیہ السلام کی صلح شیعہ کے نزدیک کسی طرح قابلِ اعتراض نہیں ہو سکتی جو ہوا وہی عقل کا تقاضا تھا :

شیعوں کے نزدیک یہ سلسلہ مسلم ہے کہ جب تک کوئی شخص معصوم اور منصوص نہ ہو اُسے امام اور جانشین رسول مانا جا ہی نہیں جا سکتا۔ یہ بھی معلوم ہے کہ امام صاحبِ اعجاز ہوتا ہے اور یہ بھی واضح ہے کہ امام کا علم وہی ہوتا ہے حسبِ تعلیمِ خدا اور رسولِ علمِ ما کان وما یکون بھی امام کی دسترس سے باہر نہیں۔ اب یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ اگر کوئی شخص امامِ حسن کی امامت کا بھی ادعا کرتا ہے اور پھر آپ کی صلح کو قابلِ اعتراض سمجھتا ہے تو اس کا تشیع کیسا ہے۔ یا تو اس نے امامِ حسن کو امام ماننے میں غلطی کی یا امام کے فعل کو صرف معمولی حیثیت کے آدمی کے مثل سمجھا جو معصوم نہ ہونے کے سبب غلط کر سکتا ہے، یا امام کی عقل کو اپنی عقل سے کم جانا کہ ہم جس بات کو کلامِ کلامِ غلط سمجھ رہے ہیں معاذ اللہ امام کی سمجھ میں اتنی واضح اور سامنے کی بات بھی نہ آئی اور اس طرح نہ صرف دامنِ حسن ہاتھ سے چھوٹتا ہے بلکہ رسولِ مقبولؐ اور علیؑ رضی اللہ عنہما بھی ہاتھ سے جاتے ہیں، جنھوں نے معاذ اللہ ایسا امام منصوص و منصوب کر دیا۔ اور آگے چل کر سید الشہداء کا دامن بھی چھوٹتا ہے کہ انھوں نے ایسے امام کی اطاعت کی اور ان کو امام مانا، بلکہ چونکہ نص اور عصمت کی بنیاد اول خود خداوند عالم سے شروع ہوتی ہے انکار کا سلسلہ وہاں تک جا پہنچتا ہے کہ اس نے معاذ اللہ غلط انتخاب کیا اور ایسے شخص کو امام بنا دیا جو مصالحِ رعیت سے بے پرواہ اور تن آسانی کا دلدادہ اور اپنی جان بچانے کا دلدل و شیدا تھا۔ اگرچہ ایک با عقل

کے لیے اتنا ہی کافی ہے لیکن مزید اطمینان کے لیے یہ بھی عرض کر دینا مناسب ہے کہ جس جبینی قربانی نے ایسا والد و شہداء کو رکھا ہے کہ صرف مرجانا ہی خدمتِ دین نظر آتا ہے اور دوسری تمام دینی کوششیں کوئی قیمت نہیں رکھتیں اس کی بھی کوئی حیثیت رہ جاتی ہے یا نہیں (العیاذ باللہ) غلط کار امام کا بنایا ہوا امام یعنی امام سوم کا نامزد کردہ امام مظلوم پھر امام ہی کہاں رہتا ہے۔ اگر سنت کے اصول سے لیجئے تو جین علیہ السلام کے لیے نہ اجماع نہ اختلاف نہ شوریٰ نہ استیلاء۔ صرف شیعیت ہی کے قاعدہ نص و عصمت سے تو امام حسینؑ تک امامت پہنچتی ہے پھر معاذ اللہ وہ امام ہی کیا جو غلط کار کا بنایا ہوا ہو۔ اور نہ صرف بنایا ہوا بلکہ اس کا مطیع اور نہ صرف زندگی کا مطیع مرنے کے بعد تک مطیع اور نہ صرف محض اطاعت بلکہ امامت کا قائل۔ ان امور پر نظر کر کے کسی شیعہ کے لیے کیا گنجائش ہے کہ امام حسنؑ کے کسی فعل کو خلاف عقل کہہ سکے، یا معاذ اللہ یہ سمجھے کہ امام حسینؑ نے ایسے شخص کو امام مانا یا اس کی اطاعت کو واجب سمجھتے رہے جو ڈرپوک یا عیش پرست تھا اور باوجود اس عزم و استقلال کے جس کا اظہار کر بلا میں ہوا معاویہ صاحب سے نہ لڑ پڑے اور اسی کے پابند رہے جو امام حسنؑ نے کیا اور معاذ اللہ ان کی غلطی کی اپنے عمل سے تصدیق کرتے رہے۔ اگر اس موقع پر محض دنیا داری اور رشتہ داری کا لحاظ کرنا خیال کیا جائے تو اور بدتر ہو جاتا، حق کے مقابلہ میں کسی اور کا خیال معاذ اللہ۔ یہ تو تھا زمانہ حیات امام حسنؑ کا ذکر، اب اور اہم موقع وہ ہے جو امام حسن علیہ السلام کی وفات کے بعد اس وقت تک کا ہے جب تک معاویہ کا انتقال نہیں ہو چکا۔ یعنی پورے دس سال۔

اس زمانہ میں حسینؑ معاویہ سے لڑ کر کیوں نہ شہید ہو گئے۔ حالانکہ امام حسن علیہ السلام کی زندگی کی بہ نسبت اب کچھ اور سختیاں بڑھ رہی تھیں۔ ایسے اسباب بھی پیدا ہوئے جن سے اشتعال ہو سکتا تھا۔ امام حسنؑ کو زہر سے شہید کر دینا ہی ایک ایسا واقعہ تھا کہ اگر ہماری سی نظر ہوتی تو امام حسینؑ کے لیے جنگ کا اچھا خاصا بہانہ تھا اور ظاہر میں نظریں اس پر اعتراض بھی نہ کرتیں لیکن امام حسینؑ ہیں کہ گویا کہ بلا والے ہی نہیں۔ حالانکہ سن کی طرف غور کرو تو یہ زمانہ جلدی غصہ اور طیش میں آجانے کا ہوتا ہے مگر عصمت کے مجسموں میں خاکی خطا کار کا لہروں کے خواص دیکھنا عدم بصارت نہیں تو فقدان بصیرت ضرور ہے۔ علیؑ بھی تو شباب کی عمر میں خونِ جگر پیتے رہے اور ساٹھ کے قریب پہنچ کر دوبارہ میدانِ جنگ میں کود پڑے اور پھر آئے تو کیسے آئے، بہر حال باوجود علم امام حسینؑ جنگ نہیں فرماتے، آخر کیوں؟ معترض صاحب کی تسکین اس سے نہیں ہوتی کہ حالات اور موقع جنگ کا نہیں ہے لہذا حسینؑ بھی چپ ہی ہیں اور اسی طرح خونِ جگر پی رہے ہیں جس طرح بڑے بھائی کو پینا پڑا تھا۔ زہر خورانی سے آپ کو اطلاع تھی جیسا کہ علامہ مجلسی علیہ الرحمہ نے جلال العیون میں لکھا ہے :

”قطب راوندی نے امام جعفر صادقؑ سے روایت کی ہے کہ امام حسنؑ اپنے اہل بیت سے فرمایا کرتے تھے کہ میں بھی زہر سے اسی طرح شہید کیا جاؤں گا جس طرح رسولؐ خدا۔ لوگوں نے پوچھا کہ ایسا کام کون کرے گا؟ آپ نے فرمایا کہ میری زوجہ جودہ بنت اشعث بن قیس۔ معاویہ اس کے پاس پوشیدہ طریقہ سے زہر بھجولے گا

اور حکم دے گا کہ وہ مجھ کو کھلا دے۔ الخ

(جلال العیون حالات امام حسن)

امام حسین علیہ السلام کو اولاً بعقیدہ شیعہ امور غیبیہ میں دخل ہونا ظاہر ہے یوں بھی زہر دلانے والے کا پتہ معلوم ہو گا۔ اگر آپ ظاہر نہ فرماتے جب بھی خیال ہوتا کہ آپ پر ظاہر تھا لیکن اب تو تصریح ہو گئی۔ شیعہ اور اہل سنت مورخین و مصنفین نے جو روایات لکھے ہیں ان سے واضح ہے کہ امام حسن کو معاویہ صاحب نے زہر دلوایا۔ امام حسن کے مرنے پر علی الاعلان خوشی منائی۔ آواز تکیہ بلند کی، سجدہ شکر کیا۔ باوجود ان باتوں کے امام حسین نے جنگ نہ کی اور معاذ اللہ (گویا) اپنی جان بچاتے رہے۔ تو کیا ہر موقع جنگ ہی کا ہوتا ہے اگر ایسا مانا جائے تو پھر امام حسین پر بھی اعتراض پڑتا ہے۔

امام حسن کو زہر دلوانے والے صاحب معاویہ ہیں:

مذکورہ بالا روایت شیعہ کتاب کی ہے اب ہم اہل سنت کی کتابوں سے چند روایتیں نقل کرتے ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ امام حسن کو زہر دلوانے والے صاحب معاویہ ہیں اور ان کو اس پر کیسی مسرت ہوئی ہے:

۱۔ "امام حسن کو آپ کی عورت جعدہ بنت اشعث بن قیس کندی نے زہر دیا۔ اس مطلب کے لیے معاویہ نے مخفی طور پر یہ

لہ جعدہ حضرت ابو بکر کی بھانجی اور اشعث بہنوئی تھا۔

چال کی تھی کہ جعدہ سے کہلا بھیجا تھا کہ اگر تو کسی جیلہ سے حسن کو قتل کر دے تو میں تجھے ایک لاکھ دوہم بھی دوں گا اور تیرا یزید کے ساتھ بیاہ کر دوں گا۔“

(مروج الذهب سعودی بر حاشیہ نفع الطیب ج ۲ ص ۳۸۱ طبع مصر سطر ۱ تا ۵)

۲۔ ”آپ کو آپ کی عورت جعدہ بنت اشعث بن قیس کندی نے زہر دیا، اور ایک گروہ نے کہا ہے کہ یہ امر معاویہ کی انتہائی چالاکئی سے بذریعہ اس عورت کے عمل میں آیا ہے۔“

(استیعاب بن عبد البر ص ۱۴۴، مطبوع حیدرآباد دکن)

۳۔ ”معاویہ نے اپنے بیٹے یزید کی بیعت لینے کا ارادہ کیا تو

اسے حسن ابن علیؑ اور سعد بن ابی وقاصؓ اس راہ میں نہایت گراں گذرے چنانچہ خفیہ بازش نے دونوں کو زہر دیا اور دونوں کا کام تمام کر دیا۔“

(ابن ابی الحدید معتزلی، شرح نہج البلاغہ ج ۴ ص ۷۷ طبع مصر

و ص ۴ جلد مذکور)

۴۔ ”جب معاویہ کو امام حسن علیہ السلام کے انتقال کی خبر معلوم ہوئی فوراً مسجد شکر میں گر پڑے۔“

(ابو الفداء ج ۱ ص ۱۸۲ طبع مصر۔ عقد فرید ج ۳ ص ۳۰۳ سطر ۱۹

۲۰۰ طبع مصر۔ مروج الذهب سعودی بر حاشیہ نفع الطیب ج ۲ ص ۳۸۸)

واقعہ کی تفصیل مروج الذهب اور دیگر تواریخ سے مل سکتی ہے محل خضر

میں آواز بجیر کا بلند ہونا ابن عباس سے اس باب میں گفتگو وغیرہ قابل ملاحظہ ہے۔  
 مختصر یہ کہ ان واقعات سے واضح ہو گیا کہ امام حسنؑ کو معاویہ نے زہر دلوایا مگر  
 باوجود شہرت و علم حضرت امام حسینؑ نے جنگ نہ کی۔ اس کے علاوہ جب امام حسنؑ کو  
 قبر رسولؐ پر لے گئے اور وہ دردناک منظر پیش آیا جس پر محبان آل رسولؐ تا قیامت  
 روئیں گے، بلکہ انسانیت ماتم کرے گی۔ دُردہ کے جنازہ پر تیر باراں کیا گیا حتیٰ کہ  
 میت کے جسم سے متعدد تیز نکالے گئے، پھر بھی امام حسینؑ نے جنگ نہ کی۔ جنگ کے  
 لیے اب اور کیا بہانہ اور اسباب ہونے چاہئیں۔ آخر ان واقعات کا کوئی جواب  
 ہے یا ایسے حالات میں امام حسینؑ کو بھی معاذ اللہ مورد الزام قرار دیا جائے اس طرح  
 امام حسینؑ کے حالات شہادت سن کر اور امام حسنؑ کے حالات کو بغیر معلوم کیے ہوئے  
 ایک کی تحسین اور دوسرے پر اعتراض کرنے سے "ایں ہم رفت و آں ہم رفت" کا  
 مصداق بن جانا پڑے گا۔

## مزید سامانِ تسکین :

ابھی شیعوں ہی کی تسکین کے لیے عرض کر رہا ہوں کافی تو اتنا بھی ہے مگر مزید  
 تسلی کے لیے اور واقعات و حالات لکھے جاتے ہیں جن سے انسان ان واقعات  
 اور اسباب کو سمجھ لے گا جو امام حسن علیہ السلام کے لیے باعث صلح ہوئے تھے اور  
 جن کا خیال کر کے آپ کو خون گلو بہانے کے بجائے خونِ جگر پینا پڑا تھا۔  
 مذہبِ شیعہ بلکہ عام عقل کا مقتضی یہ ہے کہ اولاً نبی یا امام کی معرفت و انتخاب میں  
 پوری کد و کاوش کی جائے۔ عقلی اور نقلی طریقوں سے امتحانی اور امکانی آزمائش

کر لی جائے تب کسی کی نبوت یا امامت کا اعتقاد کیا جائے پھر اس کے بعد یہ ضرور ہے کہ جب نبی یا امام معصوم و منصوص ہاتھ آجائے اب اس کے احکام و افعال میں چوں و چرا کی گنجائش نہیں۔ قرآن مجید میں "اطيعوا الله واطيعوا الرسول واولى الامر منكم" ہے کسی وقت، زمانہ، حالت یا کام کا استثناء نہیں، ہر حالت واجب الاتباع ہے۔ (یا پھر ایسے بے اعتبار رسول یا امام کو اختیار ہی نہ کیا جائے جس کی دیانت یا ذہانت پر اپنی دیانت و ذہانت سے بھی کم بھروسہ ہو۔ سمجھنے کے لیے ایک مثال طیب کی ہے، مریض و تیمار دار کا فرض ہے کہ عمل سچے سے قبل ہر طرح لائق اور قابل اعتماد معالج معلوم کریں لیکن تشخیص کے بعد اس کے نسخہ اور بتائے ہوئے پر میسرور چوں و چرا نہ کریں ورنہ مریض کا خدا ہی حافظ رہے گا۔ ایمان داروں کے لیے احکام رسول کے متعلق غیر مبہم الفاظ میں قرآن نے اعلان عام فرمایا ہے:

فلا وربك لا يؤمنون	(اے رسول!) تمہارے پروردگار کی
حتى يحكموك فيما شجر	قسم یہ لوگ سچے مومن نہ ہوں گے تاوقتیکہ
بينهم ثم لا يجدوا	اپنے باہمی جھگڑوں میں تم کو اپنا حاکم (نہ)
في انفسهم حرجا مما	بنائیں (پھر بھی نہیں بلکہ) جو کچھ تم فیصلہ کرو
قضيت ويسلموا تسليما	اس سے کسی طرح دل تنگ بھی نہ ہوں
(پ ۵ ع ۲)	بلکہ خوش خوش اس کو مان بھی لیں۔

اس سے واضح ہو گیا کہ ایک شخص اپنے آپ کو اسی وقت ایمان دار کہہ سکتا ہے جب خدا رسول اولی الامر کے فیصلہ کو اس طرح مان لے کہ نہ صرف زبانی بلکہ دل میں بھی

کوئی خلش نہ رہے اور بالکل تسلیم کر لے۔ شیعوں کے نزدیک یہ بات محتاج بحث نہیں کہ ائمہ معصومین علیہم السلام کی طاعت، رسول کی طاعت اور ان کی نافرمانی رسول کی نافرمانی ہے اور سمجھ میں آنے کی بات بھی یہی ہے یا تو اس کو نبی یا ولی نہ مانو یا پھر اس کی عقل اور عمل کو اپنی عقل اور عمل سے بالاتر سمجھو۔ یہ مسئلہ بھی شیعوں کا مسلمہ ہے کہ ائمہ اثنا عشریوں سے ہر ایک کی طاعت و انقیاد بالکل ایک طرح بلکہ ایک شخص کی سی ہے جس نے ان میں سے کسی ایک کا انکار کیا اس سے خود بخود سب کا انکار ہو گیا۔

پس یہ سمجھنا چاہیے کہ امام حسنؑ پر نکتہ چینی اور امام حسینؑ کی تحمیں سے خدا، رسول یا خود امام حسینؑ راضی ہیں بلکہ ایسے شخص کو امام حسینؑ کے دربار سے بھی کوئی انعام نہ ملے گا۔ ایسا غرہ فریب نفسانی اور اغوا سے شیطانی اور جیلہ البیسی ہے جو عبادت و محبت کے بھیس میں معصیت و عداوت کو نشوونما دے رہا ہے۔ ایک شیعہ کے لیے تو یہی کافی ہے کہ امام حسنؑ امام معصوم ہیں ان کا ہر قول و فعل حرکت و سکون میزان عصمت میں تلا ہوا ہے اور اعتراض سے بالاتر ہے، مستحق اتباع و تحمیں ہے۔ یہ ممکن ہے کہ ہماری سمجھ میں کسی فعل کی مصلحت یا کسی عمل کی قیمت نہ آتی ہو مگر اس سے اس کی عظمت میں کیا کمی آسکتی ہے جو بنص خدا اور رسول واجب الاتباع مقرر کیا جا چکا ہے، ائمہ علیہم السلام کے اعمال و افعال کے جملہ فوائد و مصالح تک ہر نظر نہیں پہنچ سکتی۔ لیکن ہماری نادانانہ کیفیت اور کم علمی اصل جوہر کی شرافت و عظمت میں کمی نہیں پیدا کر سکتی، آئندہ جو چیزیں نقل کی جائیں گی ان سے کچھ وجوہ و اسباب و مصالح کا اندازہ ہو سکے گا لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ

یہی اور صرف اتنے ہی مصالِح تھے۔ یہ صرف نمونہ اور اندازہ کے لیے ہیں۔

## علوم ائمہ:

بہشتِ شیعہ ہونے کے ہمارے عقیدہ ہے اور تاریخ و دیگر کتب اہل اسلام ہماری تائید میں ہیں کہ ائمہ علیہم السلام کے علوم لدنی اور وہی تھے بذریعہ انسانی تعلیم و تعلم عام انسانوں کی طرح کسی نہ تھے۔ چنانچہ ہم اسی بنا پر انبیاء اور ائمہ علیہم السلام کو مجتہد نہیں کہتے کیونکہ اجتہاد کا نتیجہ نطقی اور ان حضرات کے علمی پایہ سے پست ہے۔ ان کے علوم یقینی اور اجتہاد سے بلند تر ہیں۔ اس بنا پر ائمہ کے تمام افعال و اعمال صرف ان ظاہری واقفیتوں پر مبنی نہ تھے جو عام انسانوں کے لیے ہوتے ہیں۔ بلکہ علوم کی انتہائی حقیقت کے مطابق اور ان احکام کے موافق تھے جو بذریعہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سینہ بہ سینہ انھیں بارگاہِ رب العزت سے پہنچے تھے یا وقتاً فوقتاً بلحاظ مواقع و مصالح بذریعہ تحدیث و الہام انھیں ملا کرتے تھے۔ علامہ مجلسی علیہ الرحمہ نے جلال العیون میں تحریر فرمایا ہے:

”خوب سمجھ لو کہ ائمہ ہدیٰ کی عصمت و جلالت مان لینے کے بعد بلافاصلہ کہ ان حضرات سے جو کچھ واقع ہو اُسے صاحبانِ ایمان کو مان لینا ہی چاہیے اور اس پر شبہ و اعتراض نہ کرنا چاہیے۔ مومنین پر واضح رہنا چاہیے کہ ائمہ جو کچھ کرتے ہیں وہ دراصل خدا کی طرف سے ہے اس پر اعتراض کرنا خدا پر اعتراض کرنا ہے۔ یہ بات ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ خداوند عالم نے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے ایک صحیفہ

بھیجا تھا جس پر بارہ مہریں تھیں۔ ہر امام (اپنے اپنے وقت میں) اپنی  
مہر توڑتا اور جو اس میں لکھا ہوتا اس پر عمل کرتا تھا۔“

علامہ مجلسیؒ کی اس تصریح کی تصدیق ائمہ علیہم السلام کے ان اعلانات سے  
ہوتی ہے جو واقعات آئندہ کے متعلق ان حضرات نے مختلف موقعوں پر فرمائی ہیں۔  
امیر المؤمنینؑ نے بارہا فرمایا ہے ما کذب و ما کذب۔ اپنی شہادت  
کے متعلق جو خبریں دی ہیں جن میں بتلایا ہے کہ رسول اللہؐ ایسا فرما گئے ہیں۔ امام  
حسینؑ کا واقعات از ابتدائے سفر تا شہادت بیان فرمانا، خصوصیت شہادت گاہ  
کا امام سلمہ کو دکھلادینا۔ اہل بیت کے ساتھ لے جانے کے لیے حجر خفیہ سے ان  
اللہ شاء ان یراھن سبایا“ فرمانا۔ امام جعفر صادق علیہ السلام کا منصور کی  
حکومت کی خبر دینا۔ امام رضا علیہ السلام کا وعلل کے مرثیہ میں ”وَقَدَّرَ بِطُوسٍ“  
کا اضافہ فرمانا۔ موقع ولیعہدی پر اس کے ناتمام ہونے کا اعلان وغیرہ  
صاف بتلاتا ہے کہ اسباب ظاہری ہی تک محدود علوم کی پابندی نہ تھی بلکہ انہیں  
جو حکم جس طرح دیدیے گئے تھے وہ ناقابلِ ترمیم تھے اور عصمت کے قدموں  
میں دنیاوی آئندھیاں لغزش نہیں پیدا کر سکتی تھیں۔

## نظامِ عمل

ائمہ اہل بیت میں سے جس نے جو کچھ کیا وہ اپنے زمانہ میں ان حوادث  
کے لیے انہیں احکام کا من عند اللہ مامور تھا ”کائنات ما کان“ اگر سکوت  
لے جو کچھ بھی ہو۔

تھا تو یہ پابندی علم کدنی۔ اگر قول تھا تو بہ اتباع تعلیم الہی وہی۔ اس قاعدہ سے کوئی امام مستثنیٰ نہیں چنانچہ امام حسن کی مصالحت اور جان نہ دینا بھی اس وقت ان شرائط اور ان حالات کے ماتحت ٹھیک حکم خدا و تعلیم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مطابق اور بالکل مطابق تھا جس میں ذرا شک و شبہ کی گنجائش نہیں، اور امام حسین کا میدان کر بلا میں مع اپنی چھوٹی سی جماعت اعزہ و انصار دریائے خون میں ڈوب جانا بھی حرف بہ حرف باطنی تعلیمات و الہامات کے مطابق تھا۔

اگرچہ واقعات گذرے ہوئے ہزار سال سے زیادہ ہو گئے مگر تاریخیں اب بھی اپنے دامن میں ان جواہر کی حفاظت کر رہی ہیں جن سے حقیقت کا پیکر آراستہ ہو جاتا ہے۔ ظاہر داری اور ظاہر پرستی اور آجکل کی اصطلاح کا پروگنڈا باطن میں اور حق پرست قلوب میں اضطراب نہ پیدا کر سکتا تھا نہ کیا۔ فخری کی عبارت ذیل ملاحظہ ہو :

”جب امیر المؤمنین علیہ السلام خوارج سے جنگ کے لیے نکلے تھے تو خوارج کچھ جلدی جلدی آگے بڑھنے لگے، تو لوگوں کو خیال ہوا کہ خوارج پل سے پار اتر گئے چنانچہ لوگوں نے آپ سے آکر عرض کی کہ یا امیر المؤمنین وہ لوگ پل سے پار اتر گئے (جلدی) ان سے مقابلہ کر لیجئے ایسا نہ ہو کہ وہ لوگ دور نکل جائیں۔ آپ نے فرمایا کہ وہ لوگ تو پل کے اسی پار قتل کیے جائیں گے، خدا کی قسم تم میں سے دس آدمی بھی قتل نہ ہوں گے اور ان میں سے دس آدمی بھی نہ

بچیں گے۔ یہ سن کر آپ کے قول میں لوگ شک کرنے لگے۔ لیکن جب پل کے قریب جا کر دیکھا تو یہی دیکھا کہ وہ لوگ واقعا پل کے پار نہیں گئے ہیں اس وقت اصحاب امیر المومنینؑ نے نعرہ تکبیر بلند کیا اور آپ سے عرض کی کہ یا امیر المومنین! آپ کا ارشاد بجا تھا۔ آپ نے فرمایا ہاں ہاں (کیوں نہ ہو) قسم بخدا میں نے نہ کبھی جھوٹ کہا اور نہ مجھ سے کبھی جھوٹ کہا گیا۔ (یعنی جس نے مجھے بتلایا ہے وہ رسولؐ ہمیشہ کا صادق، امین ہی تھا)۔

(فخری مطبع رحمانیہ مصر ص ۷۰، ۱۳۴۵ھ)

اس واقعہ کے تفصیلات دوسرے کتب میں بھی موجود ہیں۔ جناب شیخ مفید علیہ الرحمہ نے ارشاد میں اس واقعہ کو اور ذرا تفصیل سے لکھا ہے (اس سے لوگوں کی سازش اور امتحان امیر المومنینؑ کا بھی پتہ چلتا ہے) معلوم ہوا کہ ان حضرات کے افعال صرف ظاہری شور و غوغا اور سرسری اطلاعات پر مبنی نہ تھے بلکہ ان یقینی علوم پر مرتب ہوتے تھے جو بوحی الہی رسولؐ تک اور بتعلیم رسولؐ آل رسولؐ تک پہنچنے ہوتے تھے۔ اس قسم کے واقعات کتب سیرت تاریخ میں کم نہیں ہیں جن میں اس کی تصریح ملتی ہے کہ غیبی تعلیم کے ذریعہ ان حضرات نے آئندہ واقعات کو بتلایا اور پھر اس پر متفرع ہونے والے احکام دیے یا اس کے خود پابند رہے۔ مختصر یہ کہ جنگ صلح بھی انہیں مخصوص احکام کی پابندی میں ہوتی تھی۔ اس کی مثال انبیاء سابقین میں بھی موجود ہے۔ جناب ابراہیمؑ، حضرت لوطؑ، حضرت نوحؑ، حضرت یونسؑ

کی کس کس طرح مخالفت کی گئی اور ان پر کیا کیا ظلم و ستم کیے گئے۔  
 مگر ان حضرات نے جنگ کر کے جان نہ دے دی، بلکہ کبھی شہر چھوڑ کے،  
 کبھی تقیہ میں زندگی بسر کر کے جان بچائی لیکن اپنا کام لہذا کیا، اور جب  
 نافرمانوں کے ہلاک کرنے کا وقت آ گیا تو آسمان سے باراں اور نور سے  
 فوراً شروع ہو گیا۔ "لا تذر علی الارض من الکافرین دیارا"  
 کا عمل ہو گیا۔ جناب یحییٰ و ذکریا علیہم السلام نے تیغ ہونا اور زبردہ  
 آ کر ٹکڑے ہو جانا گوارا کیا اور اپنی بات پوری کی (وہی الہی مشن)، جناب  
 عیسیٰ نے جنگ نہ کی، پر نہ کی (اپنا کام کر گئے)، جناب موسیٰ نے جب حکم  
 پایا صفت آرائی کی، ورنہ وہی موسیٰ تھے جو کس کس طرح چھپتے پھرتے تھے (مگر  
 ہر حال میں اپنا کام کرتے ہی رہے اور یہی کامیابی اور ان کی زندگی کا  
 مقصد اصلی تھا۔ سچ ہے:

نہ ہر جائے مرکب توں تاختن

کہ جاہا سپر باید انداختن

خدا کے پیارے اور اس کی طرف سے خلق خدا کی اصلاح پر مامور  
 بندے دنیا اور اہل دنیا کی مدح و مذمت پر نظر نہیں رکھتے بلکہ انہیں وہ  
 خدمت پیاری ہوتی ہے جس پر خدا نے انہیں مامور کیا ہے اور اس کی  
 ترویج و بقا و استحکام کے لیے وہ اسی دستور العمل کے پابند ہوتے ہیں  
 جو خدا کی طرف سے انہیں دیا جاتا ہے۔ اگر اصل خدمت ادا نہ ہوئی تو  
 لاکھ دوسرے محنت آجائیں سب ناقابل التفات۔ اور اگر اصل خدمت

ادا ہو گئی تو لاکھ چینیئے والے چینا کریں ان کی ملامت پہنچ۔ کس مسلمان میں یہ دم ہے کہ روح اللہ کو ٹوٹے کہ آپ نے موسیٰؑ کی تیغ کیوں نہ بلند کی، یا کس مسلمان کے منہ میں زبان ہے کہ کلیم اللہ سے پوچھے کہ آپ نے یحییٰؑ کو ذکریا کی سی مظلومی کیوں نہ اختیار فرمائی۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ امام حسین علیہ السلام کی قربانی تو مظلومی کے سبب قابل تحسین رہ جائے اور امام حسنؑ کی صلح باوجود ان شاندار نتائج کے جو صلح سے حاصل ہوئے صرف مرزہ جلنے کے سبب قابل نکتہ چینی بن جائے۔

اگر انبیاء سابقین کے اختلاف عمل کی توجیہ، اختلاف حالات ہو سکتی ہے، تو ان دونوں جگہ گوشگان خاتم الانبیاء کے اقدامات کو بھی اختلاف وقت ابتداء وقت سے مقابلہ کے لیے مختلف سلاح کے استعمال میں حق بجانب ہی کہنا چاہیے۔ ایک کا وقت ایسا تھا کہ "صبرت و فی العین قذی و فی الحلق شحی ارئی تراشی نمہا" کا منظر دیکھیں، دوسرے کا عہد یہ تھا کہ "لا یبالی عمدک وقع ہو علی الموت امر وقع الموت علیہ" پر کار بند ہو جائے۔ چنانچہ ہر ایک نے اپنے اپنے وقت میں وہ کیا جو چاہیے تھا اور اس سے بہتر ممکن نہ تھا کس کی طاقت ہے کہ یتد الشہداء کی قربانی کا حق مدح ادا کر سکے اور کس کا جگر ہے کہ مظلوم مسموم کے خون جگر پینے پر جبر و صبر کر کے دین بین کی حفاظت کا حق تو صیغہ پورا کر سکے۔ اصل

---

لہ میں نے صبر کیا حالانکہ آنکھوں میں غلش تھی اور حلق میں پھندے لگے ہوئے تھے۔  
میں اپنی میراث کو لٹتے دیکھ رہا تھا۔

مٹے فکر نہیں موت مجھ پر غالب آئے یا میں موت پر غالب آؤں۔

یہ ہے کہ دونوں شہزادوں کے وقت اور انہائے وقت میں نمایاں فرق ہے۔ حسن کا سابقہ معاویہ سے تھا، حسین کا قصہ یزید کے مقابلہ کا تھا۔ شیعہ، سنی، مسلم، غیر مسلم کوئی شخص جو ذرا سی بھی واقفیت رکھتا ہو گا یہ نہیں کہہ سکتا کہ معاویہ و یزید کا عام مطالبہ، معاویہ و یزید کا سن، معاویہ و یزید کا حسن و حسین سے مطالبہ، معاویہ و یزید کی عام انسانوں سے خواہش، معاویہ و یزید کا برتاؤ، معاویہ و یزید کا مزاج، معاویہ و یزید کا کیریئر، معاویہ و یزید کے متعلق عام مسلمانوں کا عقیدہ، بالکل یکساں تھا۔ تاکہ مقابلہ کرنے کے لیے دونوں کے مقابلہ میں یکساں سلاح اور ایک سی سیاست صحیح ہو سکے۔

شیعوں کے سامنے ان حالات اور واقعات کی زیادہ تفصیل اس لیے ضروری نہیں کہ وہ بہت کچھ جانتے اور سنتے رہتے ہیں۔ البتہ آئندہ ابواب میں غالباً اس کی ضرورت پڑے۔ اجمالاً اگر ان مذکورہ بالا حالات کے امتیاز و تفرقہ پر نظر کر لی جائے تو بہت کچھ اشکال حل ہو جائے اور ہرگز امام حسن سے کربلا کی کسی قربانی کا مطالبہ اور حسین سے صلح حسن کی خواہش کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

## امام حسن کی صلح حضرت علیؑ اور رسالتِ مآب کے افعال و احکام

سے موبد ہے

قرآن مجید اور احادیث اہل اسلام کتب تواریخ و تفاسیر نہایت وضاحت سے تفسیر کا حکم بیان کر رہے ہیں۔ لیکن اگر ان سے قطع نظر کی جائے تو شیعہ تفسیر سے

سے انکار ہی نہیں کر سکتا۔ ایسی صورت میں ایک طرف تقیہ کے جواز کا قول اختیار کرنا اور دوسری طرف امام حسنؑ کو اس کا موقع نہ دینا کس درجہ تعجب خیز ہے۔ پھر اس صلح کو اگر تقیہ کی ایک فرد کہہ دیا جائے تو اعتراض ختم ہو جاتا ہے اگرچہ کوئی کوتاہ فہم یا ضدی طبیعت تقیہ سے خوش نہ ہو مگر دور بین اور حکمت پسندانہ تقیہ سے کنارہ کشی کر ہی نہیں سکتا۔ ظاہر ہے کہ تقیہ اسی وقت ہوتا ہے جب تقیہ نہ کرنے میں اس سے بڑی خرابی پیدا ہوتی ہو۔ ظاہر میں اگرچہ تقیہ کرنے والا شکست کھاتا ہے مگر واقع میں وہ اصول اور انسانیت کی فتح ہوتی ہے۔ انبیائے سابقین کی سیرت پر نظر ڈالیے، جناب ابراہیمؑ کے واقعات، جناب موسیٰؑ کے حالات کیا بتاتے ہیں، خود سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کیا کہتی ہے۔ قرآن و احادیث نے کس حکیمانہ رفتار کی تعلیم دی ہے کیا جاویدجا جنگ کرنا مدوح ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔

جب ہم رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت پر نظر کرتے ہیں تو ہمیں بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہر موقع جنگ کا نہیں تھا، ورنہ ہر جگہ آپؐ نے شمشیر زنی ہی سے کام لیا ہوتا۔ لیکن صبر و سکوت کے معنی ہرگز یہ نہیں کہ جانب مخالف کی حقیقت ثابت ہو جائے۔ جبراً جبر ہی رہے گا اور صبر، صبر ہی کہلائے گا۔ غور کیجئے، جناب رسالت مآبؐ نے ابتداءً دعوت اسلامی مخفی شروع کی، جیسا کہ تواریخ اور احادیث سے روشن ہے، ابتدا ہی میں آپؐ نے اعلان نہ کر دیا۔ اگر ایسا کرتے تو لامحالہ مادی سامان میں غلبہ رکھنے والے کفار غالب آجاتے اور اگرچہ آپؐ کو شہادت کا درجہ حاصل ہو جاتا مگر اس سے زیادہ اہم اور

ضروری مسئلہ جو آپ کی غرض بعثت تھی یعنی تیسرے مکارم اخلاق و ترویج دین اسلام وہ آپ کے ساتھ ہمیشہ کے لیے دفن ہو جانا اور آپ اپنے مشن میں پوری طرح ناکامیاب ہو جاتے۔ چاہے کوتاہ نظر کہہ بھی لیتا کہ آپ بڑے بڑے نڈر تھے بڑے بہادر تھے، سارا عرب ایک طرف آپ نے اکیلے اپنی بات کا اعلان کر کے جان دے دی۔ لیکن کیا یہ واقعی قابل تحسین امر ہوتا، ہرگز نہیں بلکہ مشن کی ناکامیابی پر تو کوئی نڈر اور بہادر بھی مشکل ہی سے کہتا البتہ تا فہم اور ضدی کہا جاتا۔ ابھی تو یہ پہلی منزل تھی جس نے بتایا کہ جنگ نہ کرنا ہر جگہ معیوب نہیں۔ جنگ نہ کرنے والا ہر موقع پر باطل پرست نہیں ہوتا۔ جنگ نہ کرنے سے مد مقابل کی حقیقت ثابت نہیں ہوتی۔ جنگ کر کے جان دیدینے کے مقابلہ میں مشن (ہدایت و تبلیغ دین حق) کی کامیابی زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ اگر جنگ نہ ہو اور اس طرح مشن کامیاب ہو جائے تو جنگ نہ کرنا اور مشن کو کامیاب بنانا دانائی اور پیروی سنت رسول ہے۔

اس سے زیادہ واضح اور شرح آنحضرت کے احکام ہجرت حبشہ اولیٰ اور ہجرت حبشہ ثانیہ ہیں کہ آپ نے کفار کے تغلب و ایذا رسانی سے تنگ آکر مسلمانوں کو ایک نصرانی بادشاہ کی پناہ میں بھیجا لیکن اتنے حضرات کو لیکر جنگ نہ کی۔ ابن خلدون نے لکھا ہے کہ حبشہ میں مہاجرین کی تعداد تین سو تک پہنچ گئی تھی، اور حیات القلوب میں ہے کہ علاوہ عورتوں کے اور بچوں کے صرف مردوں کی تعداد ۸۲ تھی جس کا مطلب بھی تقریباً اسی حد تک پہنچتا ہے۔ ان کے علاوہ وہ لوگ بھی تھے جو مکہ ہی میں رہ گئے تھے باوجود

اتنی تعداد کے جس میں حضرت علیؑ، حضرت جعفر طیار، عبداللہ بن مسعود، زبیر بن العوام، عبدالرحمن بن عوف، ابو بکر، عثمان بن عفان، عثمان بن مظعون ایسے ایسے لوگ شامل ہیں یعنی ظاہراً مددگاروں کی بھی کمی نہیں (ان میں کچھ شیعہ سنی دونوں کے خیال کے مطابق کچھ خاص خاص عقیدہ کے لحاظ سے بڑے اہم لوگ موجود ہیں اور سب کے نام نہیں لکھے جاتے۔ ظاہر ہے کہ تین چار سو آدمیوں میں سے ابھی اور بہت سے نبرد آزماؤں کے نام باقی ہیں۔ اب فرمائیے، کیا رسالت مآبؐ کا جنگ نہ کرنا جان نہ دے دینا کسی شیوہ مسلمان بلکہ کسی باعقل غیر مسلم کے نزدیک بھی قابل ملامت ہو سکتا ہے؟ آخر امام حسنؑ کا جان نہ دینا کیوں قابل ملامت ہے، درآئنا لیکہ آپ کے مددگاروں کی تعداد بالکل محدود بلکہ بمقابلہ دشمن مفقود تھی۔ جس کی تفصیل کتب سیر و تواریخ میں موجود ہے جو تاویل سرور کائنات کے جنگ نہ کرنے کی ہو سکتی ہے وہی امام حسنؑ کے لیے بھی حاصل ہے۔ (یہ شبہ نہ ہو کہ مہاجرین حبشہ کی تعداد بالکل ہی کچھ حدیث نہ تھی کیونکہ جب ہم اسلام کی سب سے پہلی اور نہایت اہم جنگ پر نظر ڈالتے ہیں تو باوجود دشمن کی بہت بڑی تعداد کے بدر میں مسلمان صرف ۳۱۳ ہی تھے۔)

ذرا اور بڑھیے ستم بعثت میں رسول صلعم دارِ ارقم میں پناہ لیتے ہیں یہ وہ وقت ہے کہ علاوہ ان مہاجرین حبشہ کے مسلمانوں کی تعداد ۳۹ مردوں کی ہے ان میں حضرت حمزہؓ اور عمر صاحبؓ بھی داخل ہیں (شیعہ دسٹی دونوں آنکھوں سے دیکھئے) لیکن رسول خداؐ ہیں کہ جنگ نہیں کرتے اور دارِ ارقم میں چھپے بیٹھے ہیں (امام حسنؑ پر اعتراض کرنے والے بہادری اور جس کے معانی پر غور کر کے

جواب رکھتے ہوں تو عنایت کریں۔

کفار مکہ نے تذلیل کی، رسوا کیا، ہر قسم کے مظالم کیے، مگر  
آپ نے جنگ نہ کی

یہ خیال نہ ہو کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے اتباع پر  
کوئی تشدد تو تھا نہیں نہ انھیں ذلیل و رسوا کیا جاتا تھا، نہ قتل و غارت کی نوبت  
تھی، نہ بدسلوکی و بدزبانی تھی۔ پھر کیوں لڑتے؟ اس لیے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایسے  
ایسے عظیم مصائب توڑے جاتے جس کی حد نہیں مگر ان سب ظاہری ذلتوں کو برداشت  
کیا جاتا ہے لیکن جنگ نہیں کی جاتی بلکہ اصل مطمح نظر پیش نظر رہتا ہے۔ آخر اس وقت  
کیوں نہیں یہ سوال کیا جاتا کہ ایک بہادر اور بہادر بھی کیسا، علی کا استاد ایک غیر منید  
اور غیرت مند بھی کیسا جس سے عالم نے غیرت کے سبق سیکھے۔ اعتراف و اجاب، اعوان  
و انصار کے ہوتے ہوئے کیوں نہیں آن کی آن میں سب کو فنا کر دیتا، یا خود لڑ کر  
جان دے دیتا اور (حاکم بدین)، اس طرح کی بے غیرتی یا صبر و سکوت کو ادا کرتا ہے  
ملاحظہ کیجئے حالات اہل اسلام۔ غریب مسلمانوں پر ایسے ایسے مظالم کیے جاتے ہیں کہ  
اللہ کی پناہ۔ کفار ان لوگوں کو گرم ریت پر دھوپ میں سلاتے، گرم پتھر جسم پر  
باندھتے، دھوپ میں لوہے کی زرہ پہناتے، ڈرے مارتے، کھانا پانی بند کر دیتے۔  
چنانچہ حضرت عمار یا سر اور ان کے والدین پر جو ظلم ہوا اس سے روح لرزنی ہے  
اور تن بدن کانپ اٹھتا ہے۔ ایک دن عمار یا سر، ان کے والدین اور ہمشیر کو  
گرم ریت پر لٹا دیا تھا اور مارتے جاتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے

دیکھا اور فرمایا اسے آل یا سر صبر کرو کہ تمہاری وعدہ گاہ جنت ہے۔ آخر کار ابو جہل مردود نے سمیہ مادر عمار کو نیزہ چھو کر ہلاک کر دیا اور یاسر کو اتنا مارا کہ جاں بحق ہو گئے۔ صہیب و حباب وغیرہ نے بھی اذیتیں اٹھائیں۔ حضرت عمر اپنی لونڈی کو اسلام قبول کرنے پر اتنا مارتے تھے کہ تھک جاتے تھے اور پھر دم لے کر مائے لگتے تھے۔ اپنی بہن کو تو اس طرح مارا تھا کہ لہو لہان ہو گئی تھیں۔ ابو جہل نے اپنی کینز کو اتنا مارا کہ اندھی ہو گئی۔ بلال کے آقا نے غلاموں کو حکم دیا تھا کہ صبح کو دن چڑھے بول کے کانٹے بلال کے بدن میں چھو دیا کرو اور جب آفتاب خوب گرم ہو تو ان کو دھوپ میں لٹا کر از سزا پا گرم پتھر رکھا کرو تا کہ ہل نہ سکیں اور گردا گرد خوب آگ جلا دیا کرو کہ خوب جلیں۔ اور جب شام ہو ہاتھ پیر باندھ کر اندھیری کو ٹھہری میں قید رکھو اور باری باری تازیانے مارا کرو اور صبح تک یہی کام کیا کرو۔ اسی طرح ایک مدت گزری مگر حضرت بلال پکار پکار کر احد احد کہا کیے۔ (دیکھو تاریخ اسلام) خود آنحضرت کے ساتھ بھی ایسی بدسلوکیاں کی جاتیں کہ آپ نے خود فرمایا ہے:

ما اوذی نبی مکا اوذیت۔ آپ کو مجنوں کہتے، ساحر، کاہن اور ازیں قبیل کیا نہیں کہا جاتا۔ جب راہ سے گزرتے تو قریش کہتے کہ یہ شخص بھلا چنگا تھا دفعۃً دماغ پھر گیا۔ آپ کی گزرگاہ میں آپ کے گھر کے قریب گندگی ڈال دی جاتی، کانٹے بچھائے جاتے۔ جو شخص مکہ میں آتا اس سے کہا جاتا کہ محمد کی بات نہ ماننا، غرض ہر طرح کی اذیتیں دی جاتیں، حضرت حرم کعبہ میں آتے جب بھی تانے والے بازو آتے وہاں بھی ستایا جاتا، آوازے کسے جاتے، حتیٰ کہ ایک روز عقبہ بن ابی معیط نے آپ کے گلے میں پھندا ڈال کر گلاتا گھونٹا، روایت خمیس و روضۃ الاحباب

وغیرہ۔ (یہ روایت بخاری، مسند احمد بن حنبل، صواعق محرقہ، تفسیر کشاف میں بھی ہے)۔ اس پر حضرت ابو بکر نے رونائینا شروع کیا تو وہیں کفار نے ان کو ڈاڑھی پکڑ کر اتنا مارا کہ سر پھوٹ گیا۔ جب آنحضرتؐ بازار جاتے تو لوگ چھپڑتے طعنہ زنی کرتے جب وعظ فرماتے تو شور و غل مچاتے۔ تالیاں بجاتے، بیہودہ گیت گاتے، خاک پھینکتے۔ آپ خانہ کعبہ میں نماز پڑھ رہے ہیں، سر بسجود ہیں کہ آپ پر اونٹ یا گوسفند کی اوجھڑی ڈال دی گئی ہے، اس طرح عبادت تک کی اہانت ہو رہی ہے، غرض کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا گیا مگر آپ برابر صبر و سکوت کرتے رہے۔ بروایت حیات القلوب آپ نے حضرت خدیجہ کے گھر میں پناہ لی ہے اور کفار باہر سے سنگ باری کر رہے ہیں، اور حضرت علیؑ و خدیجہؓ رضی اللہ عنہما کے سینہ سپر ہیں۔ (اس صبر آزمائی کی مدت اور امام حسنؑ کی صبر کی مدت کا بھی مقابلہ کرو)۔

ان تمام حالات پر غور کرو، اس سے زیادہ کیا سختی، ذلت و رسوائی، اور ظلم تشدد ہو سکتا ہے۔ پھر سرد کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے زیادہ بہادر غیرت مند کون ہو سکتا ہے۔ پھر بھی آپ کا جنگ نہ کرنا اور اس پر صبر و سکوت (پھر نہ ایک نہ دو برس، بلکہ اپنی مدت رسالت کا آدھلے سے زیادہ زمانہ تک جنگ نہ کرنا، جو لوگ آپ پر ایمان لائے ہیں ان کا گھٹ گھٹ کے مر جانا، قید و بند، تشنگی، گرسنگی برداشت کرنا دیکھتے ہیں مگر نہ لڑتے ہیں نہ جان دیتے ہیں۔ پھر آخر امام حسنؑ کا جنگ نہ کرنا کس طرح محل ایراد و اعتراض ہو سکتا ہے۔ اگر رسول کے لیے صبر و سکوت ظاہری ذلت و رسوائی کا برداشت کر لینا، اپنے ساتھ اور دوسرے مومنین کا بھی اذیتیں اٹھاتے دیکھنا اور کچھ نہ بولنا

جائز ہے تو امام حسن کے لیے بدرجہ اولیٰ جائز ہے۔

یہ حالات نبوت کے چھٹے سال تک کے تھے۔ ساتویں اور اٹھویں سال میں شعب ابی طالب کی قید، اللہ اکبر وہ مصیبت عظمیٰ تھی جس کی انتہا نہیں (جو ہجرت حبشہ میں نہیں گئے تھے وہ) تمام بقیہ اعزہ و انصار سمیت اس طرح قید ہونا کہ نہ کسی سے لین دین ہو سکے، نہ خرید و فروخت، نہ باتیں ہو سکیں، نہ ملاقاتیں، ساری رات حضرت ابو طالب خود بر نفس نفیس پہرہ دیتے ہیں، رسول خدا کو ایک جگہ سلاتے ہیں، کچھ رات گزارنے پر وہاں سے اٹھا کر کسی دوسری جگہ لے جا کر سلاتے ہیں اور رسول کی جگہ پر علیٰ کو سلا دیتے ہیں۔ اسی طرح ادل بدل میں رات گزاری جاتی ہے، پھر سارا دن اولاد ابو طالب پہرہ دیتی ہے اور اسی طرح برسوں گزارنا پڑتے ہیں۔ یہاں تک نوبت پہنچی تھی کہ رات کو بچوں کی فریادوں سے کفار کی نیند بھی حرام ہو گئی۔ سب کچھ ہوا مگر نہ حضرت نے جنگ کی نہ جان دے کہ مرتبہ شہادت حاصل کیا۔ آخر وہ وقت آیا کہ بغیر جلا وطنی چارہ نہ رہا۔ ہجرت مدینہ کی ٹھہری اس تمام دوران میں مصائب کا سلسلہ کچھ بڑھتا ہی گیا، انصار میں اضافہ ہوتا رہا امرحق بڑھتا گیا، اشاعت دین ہوتی گئی مگر جنگ نہ ہوئی (خاکم بدہن، گھر چھوڑ کے جاکر پڑا۔ ہجرت گوارا کی مگر لڑکے مرجانا منظور نہ ہوا۔) اس کو بہادری کے خلاف کہا جائے، غیرت کے خلاف سمجھا جائے، جان چڑانا کہا جائے یا یہ کہا جائے کہ اذیتیں برداشت کرتے ہوئے دین حق کی اشاعت کو مقدم کرنا۔ یہی اصل شجاعت ہے اور غیرت شرعیہ کا یہی مقتضی ہے اور دین کی تعلیم و ترویج

ہی سب سے زیادہ قیمتی ہے، اب بہ نظر غور امام حسنؑ کے صبر و سکوت کو ملاحظہ کیجئے اور رائے دیجئے۔ کسی مزید توضیح کی ضرورت نہیں، اگر عقل و انصاف کوئی واقعی چیز ہے تو یہ بالکل واضح ہے کہ جس طرح کفار کے ظلم سہتے رہے اور دین رسولؐ بڑھتا گیا ٹھیک اسی طرح دین اہل بیت (جو حقیقی دین رسولؐ ہے)، امام حسنؑ کے ظلم سہنے کے زمانہ میں اندر اندر جڑ پکڑتا گیا جو جنگ کر کے مرجانے میں امام حسنؑ کے ساتھ ہی دفن ہو جاتا۔ تاریخیں اور خصوصاً مہمان اہل بیت پر مظالم کی تاریخیں اس کی شاہد عادل ہیں، اور آگے بڑھے تو ان واقعات سے اور زیادہ توضیح ذاتیہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صلح حدیبیہ ہے۔

## صلح حدیبیہ :

ہجرت کا چھٹا سال ہے، ذیقعدہ کا مہینہ، سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رات کو خواب دیکھتے ہیں اور صبح کو مکہ کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں، مہاجرین و انصار بھی ساتھ ہو لینے ہیں، ڈیڑھ ہزار مسلمان ساتھ ہیں، منزلیں طے ہوئیں، اب مکہ بہت قریب رہ گیا۔ ادھر کفار کو خبر ہوتی ہے کہ آنحضرتؐ اتنے آدمیوں کے ساتھ آ رہے ہیں، چنانچہ وہ مزاحمت پر آمادہ ہو گئے۔ ادھر آپ کو اطلاع ملی، بس آپ نے مکہ سے ایک منزل ادھر ہی چاہ حدیبیہ پر ڈیرہ ڈال دیا، طرفین سے اپیلچی آنے جانے لگے۔ مگر کچھ ایسا سامان ہو گیا کہ جنگ کی تیاری ہونے لگی۔ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اصحاب سے بیعت لینا شروع کی۔ ایک درخت کے نیچے یہ رسم ادا ہونے لگی (اسی کو بیعت رضوان یا بیعت شجرہ

بھی کہتے ہیں۔ ان بیعت کرنے والوں کو اصحابِ سمرہ بھی کہتے ہیں، خلاصہ یہ کہ یہ افراد ہوا کہ نہ بھاگیں گے نہ لڑائی سے کبھی منہ موڑیں گے۔ چنانچہ چودہ سو یا پندرہ سو پچیس آدمیوں نے بیعت کر لی۔ اب جنگ شروع ہونے کو باقی ہی کیا تھا کہ سہیل کو قریش نے صلح کا پیغام لے کر بھیجا، آپ نے اس دعوت کو رد نہ فرمایا اور بجائے اس کے کہ آپ اتنے معاہدہ کر چکے والوں کو لے کر لڑ جاتے اور یا توجیح ہی کر لیتے یا پھر شہادت ہی نصیب ہوتی، صلح پر آمادہ ہو گئے۔

”چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علی بن ابی طالب کو بلا کر حکم دیا کہ لکھو بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ اس پر سہیل نے کہا کہ ہم اس کو نہیں جانتے باسم اللہ لکھو۔ چنانچہ یہ لکھا۔ پھر فرمایا کہ اس طرح لکھو کہ یہ وہ صلح نامہ ہے جس پر محمد رسول اللہ اور سہیل بن عمرو نے مصالحت کی ہے۔ اس پر سہیل نے کہا کہ اگر ہم آپ کو رسول خدا ہی جانتے تو آپ سے جنگ کیوں کرتے البتہ اپنا اور اپنے والد کا نام لکھو ایسے۔ رسولؐ نے فرمایا کہ اچھا لفظ رسول اللہ کو مٹا دو۔ اس پر حضرت علیؑ نے عرض کی ”رسول اللہ“ تو مجھ سے کبھی مٹایا نہیں جاسکتا۔ تب آپ نے خود کاغذ لے لیا اور ”رسول اللہ“ کی جگہ محمد بن عبد اللہ لکھ دیا، اور فرمایا کہ اے علیؑ! ایک دن تم کو بھی ایسے معاملہ میں مبتلا ہونا پڑے گا۔“ (تاریخ کامل ابن اثیر ج ۲، ص ۷۷، طبع مصر)

اس صلح نامہ کے شرائط حسب ذیل ہیں:

۱۔ معاہدہ صلح دس برس ہوگی، اس اشار میں کوئی فریق دوسرے کی جان

مال سے تعرض نہ کرے گا۔

۲۔ فریقین کے ہم عہد بھی اسی معاہدہ میں شامل ہوں گے۔

۳۔ اس سال اہل اسلام عمرہ بھی نہ کرنے پائیں گے۔

۴۔ آئندہ سال سے مسلمان عمرہ کر سکیں گے۔

۵۔ جب مسلمان عمرہ کے لیے آئیں تو اپنے ساتھ اسلحہ نہ لائیں صرف تلوار

مستثنیٰ ہے مگر وہ بھی نیام کے اندر رہے گی۔

۶۔ مسلمان حرم میں تین دن سے زیادہ نہ ٹھہریں گے۔

۷۔ کفار میں سے اگر کوئی شخص مسلمان ہو کر مسلمانوں کے پاس بھاگ

جائے تو واپس دیا جائے گا۔

۸۔ مسلمانوں میں سے کوئی شخص بھاگ کر کفار سے جا ملے تو وہ واپس نہ کیا

جائے گا۔ (دیکھو تاریخ ابن خلدون وغیرہ)

صلح ہو گئی اور رسالت مآب کی آنکھیں جو کچھ دیکھ رہی تھیں عام آنکھیں

بھلا کا ہے کو دیکھ سکتی تھیں۔ چنانچہ یہ صلح (حضرت حسن کی صلح کی طرح) مسلمانوں

کو اس درجہ ناگوار گذری کہ لوگوں کے قدم دگ گئے اور حضرت عمر کے متعلق

تو بخاری میں اس طرح لکھا ہے :

”عمر بن خطاب کہتے ہیں کہ اس وقت میں نبی صلعم کی خدمت

میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ کیا آپ سچے رسول نہیں ہیں؟ آپ نے فرمایا

کیوں نہیں۔ میں نے کہا پھر کیا ہم لوگ حق پر اور ہمارے دشمن باطل

پر نہیں ہیں؟ آپ نے جواب دیا کیوں نہیں۔ تب میں نے کہا کہ پھر

کیوں ہم دین میں ایسی ذلت و رسوائی گوارا کریں؟ آنحضرت نے جواب دیا کہ سنو بات یہ ہے کہ میں خدا کا رسول ہوں، اُس کے حکم کے خلاف کچھ نہیں کرتا اور وہی میرا مددگار ہے۔“

(بخاری کتاب الشروط باب الشروط فی الجہاد والمصالحة)

مع اہل الحرب پارہ ۱۱، ص ۳۰۰، مطبوعہ کوزن گزٹ

پریس دہلی۔ مزاج (ترجمہ مدارج النبوة) جلد دوم، ص ۲۳۶

مطبوعہ نول کشور پریس لکھنؤ۔

اسی کے متعلق عمدۃ القاری شرح بخاری اور روضۃ الاحباب جلد دوم، ص ۳۵۸ مطبوعہ تیغ بہادر لکھنؤ ۱۲۹۶ء میں اس طرح ہے: لقد دخلني امر عظيم وراجعت النبي صلعم مراجعة ما راجعته مثلها قط (اس دن میرے دل میں ایسا دغدغہ عظیم داخل ہو گیا اور میں نے پیغمبر کے ساتھ ایسی رد و کد کی جیسی اس سے قبل کبھی نہ کی تھی۔) بعض کتابوں میں شککت بھی ہے۔

”ابھی صلح نامہ لکھا ہی جا رہا تھا کہ ابو جندل بن سہیل پابہ زنجیر آگیا۔ اصحاب کے دل میں صلح دیکھ کر اس حد کی بدگمانی ہو چکی تھی کہ قریب تھا کہ ہلاک (گمراہ) ہو جائیں کیونکہ رسولؐ کے خواب سے (غلط تعبیر خیال کر کے) سبھوں کو اسی سال فتح کا خیال ہو چکا تھا۔ ادھر ابو جندل کو گرفتار دیکھ کر اس کا باپ بول اٹھا کہ اے محمد! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہمارے اور آپ کے درمیان معاملہ

طے ہو چکا ہے (یہ مجھے واپس ملنا چاہیے) آپ نے فرمایا کہ تو سچ کہتا ہے۔ آپ اسے قریش کی طرف واپس کرنے لگے تو وہ چیخ اٹھا کہ مسلمانو! مجھے مشرکین کی طرف اس لیے بھیج رہے ہو کہ وہ پھر مجھے بے دین کر دیں۔ اب کیا تھا لوگوں کے دلوں میں جو آگ بھڑک رہی تھی اُس میں شعلے بلند ہونے لگے آخر رسولؐ نے فرمایا، اے ابو جندل! صبر کر، بے قرار نہ ہو خداوند عالم تیرے اور تیرے کمزور ساتھیوں کے لیے کٹائش اور مخلصی کی راہ نکالنے والا ہے۔ چونکہ قوم مخالف سے عہد کر چکے ہیں اب ہم اس کے خلاف نہیں کر سکتے۔“

(کامل ابن اثیر جلد ۲، ص ۷۷ مصر)

”پس عمر بن الخطاب از جائے خویش رجعت و با ابو جندل می رفت و می گفت . . . . . و اورا بہ سبیل تعریض و کنایت تم ریض می کرد بر آنکہ پدر را بکش و آں صلح در ہم نورد و . . . . . لاکن سے بکشتن پدر بخیلی نمود“ (روضۃ الاحباب ص ۳۵۷ و ص ۳۵۸

ج دوم مطبوعہ تیغ بہادر لکھنؤ ۱۲۹۷ھ و طبری ج ۳ ص ۸ طبع مصر)

خلاصہ یہ کہ صلح ہو گئی اور نہ ٹوٹی اور انھیں شرائط پر ہوئی جو اوپر بیان ہوئی۔ کیا کوئی مسلمان جرأت کر سکتا ہے کہ معاذ اللہ رسولؐ کی ملامت کرے اور صحابہ کی اتنی تعداد اور پھر موت پر سب کی بیعت کے باوجود عبادت حج نہ بجالانا اور ایسی دبی ہوئی شرطوں کی صلح اور ظاہر ایسی بزدلی یا تن پروری دکھلانا اور لڑکے کے جان نہ دے دینا کہلا سکتا ہے؟ ہرگز نہیں!

بجائے کسی اور تصریح کے ہم اتنا کہہ دینا کافی سمجھتے ہیں کہ امام حسنؑ کی صلح کو قابل اعتراض جاننے والے اور آپ کی امامت میں اس طرح شک کرنے والے یا صلح کو غلط یا بے جا خیال کرنے والے شیعہ حضرت عمو کا ساحال رکھتے ہیں اور ان کے جواب میں حضرت رسالت مآب کی طرح امام حسنؑ کی طرف سے یہی کہا جائے گا کہ میں وحی رسول خدا ہوں۔ ولست اعصیہ وھو ناصری (چنانچہ دونوں صلحوں کی ظاہری کمزوری کوئی چیز نہیں ٹھہری۔ نتیجہ کے اعتبار سے دونوں صلحیں شان دار کامیابی اور فتح مبین ہو کر رہیں)۔

صلح حدیبیہ میں جو ستھ میں کی گئی اس قدر عدد و مدد کے ہوتے ہوئے جنگ نہ کرنے اور بظاہر دبی ہوئی (اور بقول حضرت عمر کے دین کو ذلیل کرنے والی) صلح کر لینے سے وہ شان دار نتائج رونما ہوئے جو کسی صاحب ہوش سے مخفی نہیں۔ ان لوگوں کو جو امام حسنؑ کی صلح پر اعتراض کرتے ہیں شرط ہفتم و ہشتم پر خصوصاً نظر ڈالنا چاہیے۔ اتنی دبی ہوئی تو کوئی شرط امام حسنؑ کے یہاں نہیں ملتی بلکہ روضۃ الاحباب جلد اول ص ۲۵۶ میں تو یہ الفاظ ہیں: ”در روز صلح حدیبیہ ہر شرطے کہ سہیل می کرد حضرت قبول می کرد“۔ امام حسنؑ کی صلح پر بعض لوگوں نے مذل المؤمنین کہا ہے مگر اور کوتاہ ہیں اس کو نہ جانے کیا کیا سمجھتے ہیں لیکن اگر سرور کائنات کی صلح پر فلم نعطي المدينة فی دیننا کہنا رسولؐ کے فعل کو غلط یا باعث توہین دین نہیں ہونے دیتا اسی طرح امام حسنؑ کو مذل المؤمنین کہہ کر خطاب کرنا آپ کے فعل کو باعث توہین ایمان و اہل ایمان نہیں بنا سکتا۔ امام حسنؑ کے فعل پر اظہار اضطراب و استعجاب کی کیا وقعت ہو سکتی ہے جب خود

سرورِ دو جہاں کا فعل باوجود اپنی رسالت تک یا ددلانے کے شکوک میں کمی نہ پیدا کر سکا۔ فعل رسولؐ سے اصحاب اس درجہ رنجیدہ اور غیر مطمئن تھے کہ رسالت میں شک کی نوبت آگئی۔ یہ کہنا پڑا کہ انی رسول اللہ یہ کہنا پڑا کہ لست اعصیہ یہ کہنا پڑا کہ "من فرتادہ خدام و بے فرمان وے نمی کنم و وے ناصر و معین من است و مراضیٰ نخوابد گزاشت"۔ (مدارج النبوة جلد دوم ص ۲۱۳ مطبوعہ نول کشور پریس ۱۹۱۴ء) لیکن با ایں ہمہ اطمینان پھر بھی حاصل نہ ہوا۔ جب اصحاب کی مرضی کے بالکل خلاف (اور خدا کی مرضی کے مطابق) صلح مکمل ہو چکی اب جناب رسالتؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ تو کیسے جاتے وہیں مقام حدیبیہ پر ہدی (قربانی) ادا کرنے کا حکم دیا۔ فرمایا کہ یہیں سے قربانی کر کے بال مند واکے مدینہ واپس چلو اور تین مرتبہ پے در پے یہی حکم دیا۔ مگر یاروں کی خواہش تو کچھ اور کہہ رہی تھی، کسی نے کچھ جواب نہ دیا۔ حکم کی تعمیل کوئی کیوں کرتا۔ چنانچہ آپ کو کمال ملال ہوا اور ام المومنین حضرت ام سلمہ سے اپنے اصحاب کی شکایت کی۔ چنانچہ انھوں نے عرض کی کہ پہلے آپ اپنا اونٹ قربان کر دیں اور سر منڈالیں پھر آپ کو دیکھ کر (غالبا) وہ لوگ ایسا کریں۔ چنانچہ حضرت نے اپنا اونٹ قربان کیا تب جا کے اصحاب نے بھی ایسا ہی کیا۔ لیکن (پھر بھی) کمال ٹول و محزون تھے اور قریب تھا کہ کثرتِ غم سے ہلاک ہو جائیں یا ایک دوسرے کو مار کر مر جائیں۔ (دیکھو تاریخ اسلام جلد ۲ ص ۱۱۷ مطبوعہ دہلی ۱۳۳۱ھ و تاریخ طبری ص ۸۰ جلد سوم طبع مصر) آنحضرتؐ کے عمل کے باوجود پھر بھی سب نے حلق پر عمل نہ کیا بلکہ تقصیر ہی کے عامل رہے جیسا کہ

لے سر کا بال منڈانا      لے ناخن کا ٹٹا یا بال کترنا

طبری جلد سوم ص ۸۱ سے واضح ہے۔ ایک شیعہ کو غور کرنا چاہیے کہ حدیبیہ کی صلح پر اعتراض کرنے والوں پر اعتراض کرنا اور امام حسن کی صلح پر اعتراض کرنے والوں کی فہرست میں داخل ہونا بقول شخصے یک بام و دو ہوا کا مصداق ہوتا ہے کہ نہیں۔ اس صلح پر نظر رکھتے ہوئے صلح حسن کو سمجھنے کی کوشش کروا چھی طرح سمجھ میں آجائے گا۔ ذرا انصاف سے کام لینا چاہیے۔ سرور کائنات کے ساتھ ڈیڑھ ہزار یا اس سے بھی کچھ اوپر اصحاب موجود تھے اور وہ جنہوں نے مرنے کی بیعت، جنگ سے منہ نہ موڑنے کا معاہدہ کیا تھا۔ مگر رسالت کی آنکھیں دور بین تھیں۔ لڑنے، مرنے مارنے پر صلح کرنے کو ترجیح دی گئی اور صلح بھی دب کر۔ اس حد تک کہ جو مسلمانوں میں پناہ لے وہ واپس کیا جائے، جو کفار میں پھنس جائے وہ مسلمانوں کو واپس نہ لے، اولاً تو اس سال حج ہی نہ کریں۔ آئندہ آئیں بھی تو تین دن سے زیادہ نہ رہیں اور پھر رہیں بھی تو سلاح نہ ہو۔ ایک تلوار مستثنیٰ بھی ہو تو وہ بھی نیام سے باہر نہ رہے۔ کیا امام حسن کی صلح کی کوئی شرط اتنی دبی ہوئی دکھائی جاسکتی ہے؟ اب دوسری طرف امام حسن کی حالت دیکھئے، کچھ تو ایسے منافق تھے جو نہ صرف امام پر ظاہر تھا بلکہ لوگ ان کو کھلم کھلا پہچانتے تھے۔ کچھ ایسے تھے جو نمایاں نہ تھے مگر امام بار بار ان کی تنبیہ اس طرح فرماتے تھے کہ میرے پیشتر میرے پدر بزرگوار کے ساتھ جو مجھ سے بہتر تھے تم لوگوں نے جو سلوک کیا ہے وہ ظاہر ہے، اور ان لوگوں کا ذکر تو بیکار ہی ہے جنہوں نے صرف اتنی سی جھوٹی آواز سنی کہ قیس مارے گئے اور امام پر ٹوٹ پڑے اور آپ کو لوٹ لیا بلکہ حملہ کر دیا جس سے آپ بڑی طرح زخمی ہو گئے اور حالات کی تفصیل آگے آتی ہے۔ صلح کو غلط اور جنگ کی رائے دینے

والے شیعہ امام حسن کو ایسے ہی ایمان داروں کو لے کر جہاد کی رائے دیتے ہوں تو یہ ان کی سمجھ میں آسکتا ہے۔ دانشمندی تو صلح ہی میں نظر آتی ہے۔ پھر امام حسین کی طرح لڑ کر جان دینے کا مشورہ دیتے وقت ان بہتر جاں نثاروں میں سے کسی ایک کی نظیر تو حسن کی فوج میں پیش کرو جنہیں حسین نے مرنے سے قبل ہی یہ سند عطا فرمادی تھی فانی لا اعلم اصحابا باوفی ولا خیراً من اصحابی لے پھر دونوں شہزادوں کے لیے ایک حکم کیا انصاف ہے؟۔ ادھر وفاداری منزلتِ عظمیٰ اور ادھر غداری کی پستی و تمغہ۔ پھر امام حسن کے لیے اصل دین کو زندہ رکھنا اور اس امانت کو آگے آنے والوں تک پہنچانے کے لیے بجز صلح کیا چارہ ہو سکتا تھا۔

### فوائد صلح حدیبیہ :

اس صلح کو خداوند عالم نے صلح نہیں بلکہ فتح مبین فرمایا ہے چنانچہ سرورِ عالمؐ اس صلح کو انجام دے کر واپس ہو رہے ہیں تو خدا کو اپنے محبوب کی یہ با محمل مصالحتانہ روش ایسی پسند آئی کہ جبریلؑ کے ہاتھوں انا فتحنا لک فتحاً مبیناً کی سند بھجوائی۔ اولاً تو مسلمان آئے دن کی جنگوں اور قریش اور مکہ والوں کی چھیڑ چھاڑ سے پنپنے نہیں پاتے تھے۔ اب موقع مل گیا کہ اکٹھے دس سال تک کا اطمینان ہو گیا کہ گھر کے بھیدی دشمنوں کے حملوں کی فکر نہ رہی اور اپنی حفاظت و حراست کے سامان مہیا کر لیں، زندگی کے ساز و سامان کی

لے میں کسی کے اصحاب کو نہیں جانتا جو میرے اصحاب سے زیادہ بہتر و فادار ہوں۔

طرف توجہ کریں، کچھ احکام الہیہ بہ اطمینان سن سیکھ سکیں۔ دوسری بات یہ ہوئی کہ قریش کے لوگ جو کفار کے ڈر سے مسلمان نہ ہوتے تھے وہ مسلمان ہونے لگے۔ اب صلح کے سبب باوجود مکہ میں ہونے کے کوئی انھیں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ علی الاعلان مسلمانوں کی تبلیغ اور اشاعت و تلاوت قرآن ہونے لگی اور دو ہی سال ہوئے تھے کہ مسلمانوں کی تعداد دو چند سے زیادہ ہو گئی۔ ظاہر ہے کہ حجاز میں حکومت تو قائم نہ ہوئی مگر اتنا ضرور ہو گیا کہ اللہ کا نام اور محمد کا کلمہ کوئی بڑم نہ رہا۔ ارکان اسلام کی بجا آوری کھلم کھلا ہونے لگی، ایک شخص دوسرے کو ترغیب اسلام دینے میں آزاد ہو گیا۔ ابن خلدون میں بے زہری روایت کرتے ہیں کہ جب تک مسلمانوں اور کفار قریش میں نزاع قائم تھی اُس وقت تک کوئی کسی سے مل جل نہ سکتا تھا۔ جب مصالحت ہو گئی اور لڑائی نے اپنے ہاتھ پھینچ لیے لوگوں کو امن مل گیا، ایک دوسرے سے ملنے لگے، نہ کوئی کسی کے اسلام سے متعرض ہوتا تھا اور نہ اسلام کی کوئی بُرائی کرتا تھا۔ طبری جلد ۳ ص ۸۱ بھی ملاحظہ ہو، یہاں پر ابو بصیر والا واقعہ صلح امام حسن کو اور زیادہ مضبوط بنا دیتا ہے۔

رسول اور آپ کے اہل بیت دونوں کی خواہش یہی اور صرف یہی تھی کہ جس اصول و فروع کی تعلیم کے لیے رسول کو بھیجا گیا ہے وہ قائم اور رائج ہوں اور لوگ ان کو سمجھیں، مانیں اور ان پر عمل کریں یہی ان کا مشن تھا۔ یہی اُن کی غرض بعثت تھی۔ یہی اُن کا مطمح نظر تھا، یہی اُن کی زندگی کا حاصل تھا، اسی پر ان کا عمل تھا، اسی پر حیات تھی، اسی کے لیے موت تھی اللہم احییٰ حیٰۃ

محمد وآل محمد و امتی مہات محمد وآل محمد۔ اسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر ان کا اقدام و انجام تھا۔ ضرورت اور وقت پڑ جائے توڑٹنے مرنے سے بھی زڈریں اور ضرورت نہ ہو تو کسی کا عبث خون بہنے نہ پائے۔ مقصد تو مشن کی کامیابی ہے۔

صلح حدیبیہ کے مذکورہ بالا فوائد سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا! اصطلاحی حیثیت سے اسلام کی جگہ ایمان کی لفظ رکھئے اور گذشتہ ساری عبارت پڑھ جائیے۔ وہ گہری سازش جو رسولؐ کی زندگی ہی میں کی جا چکی تھی اور گاہے بگاہے دلوں کا بھید زبانون پر آجاتا تھا، روز بروز مستحکم ہوتا جاتا تھا۔ سالار بنی ہاشم کی آنکھ بند ہوتے ہی بنی ہاشم اور اولاد ابوطالب کی نظر میں دنیا اندھیر کر دی گئی۔ خواہ کتنی ہی تاویل کی جائیں لیکن ایک منصف صاحب علم سے یہ بات پوشیدہ نہیں رہ سکتی کہ جو بنی ہاشم چند دن قبل تک تمام مسلمانوں کے سرتاج تھے آج وہ اتنے دبا دیے گئے کہ بقول شبلی صاحب، ان سے حکومت بزور منوانا چاہا جاتا ہے۔ وہ تمام واقعات جو صحاح احادیث اور تواریخ میں مذکور ہیں شاہد عادل ہیں کہ اہل بیت رسولؐ کو کچل ڈالنے کی کیا کیا تدبیریں کی گئیں۔ آج بھی ان امور کو بیان کیا جانا، کبھی گڑے مڑے اکھاڑنے سے کیا فائدہ، یا تبراً بازی مناسب نہیں یا آپس کی زاعی باتوں کو چھڑنا برا ہے، مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کے اسباب مہیا نہ کرو وغیرہ وغیرہ جملے کہہ کر روکا جاتا ہے۔ واقعات سے قطع نظر کہ صرف اس امر پر غور کرو کہ بعد رسولؐ امیر المومنین، فاطمہ زہرا، حسن، حسین، ام ایمن کی گواہیاں ناقابل سماعت

لے پیش قدمی و خاموشی

قرار دی گئیں اور تنہا فرد واحد جابر کی گواہی قبول کی گئی۔ ملاحظہ ہو بخاری کتاب الکفالہ اور اس پر عینی کے الفاظ۔

اس طرح اہل بیت کو غیر مسموع الکلمہ بنایا گیا۔ اُن کی حیثیت کو گرایا گیا اُن کی ہر بات قابل اعتراض اور ان کے خلاف ہر بات قابل قبول بنائی گئی۔ جب رسول کے مرتے ہی یہ عالم ہو گیا تھا تو آپ کی وفات کے بعد تیس سال تک میں کیا کیا کُھل نہ کھلائے گئے ہوں گے جس طرح اسلام کو صلح نبی سے سنبھلنے، قوت حاصل کر لینے، اطمینان کی سانس لینے اور پھیلنے کا موقع ملا اور اس طرح قدم جم سکے کہ پھر متزلزل نہ ہو سکے۔ اسی طرح صلح حسن میں بھی ایمان یعنی تعلیم رسول مطابق تفسیر اہل بیت کو بھی وہی بات حاصل ہوئی جو اسلام کو۔ اب امید نہیں کہ کوئی شیعہ اس میں چہ میگوئی کر سکے۔ بس دونوں صلحوں میں جو فرق نمایاں ہوتا ہے وہ یہ کہ کفار مکہ نے کم از کم دو ڈھائی سال تک صلح کا احترام کیا۔ بخلاف حسن کے مخالف کے کہ اُس نے اسی وقت کھلم کھلا تمام شرائط کو زیر قدم کچلنے کا اعلان کر دیا اور اُسی وقت سے علانیہ بد عہدی پر عمل کرنے لگا۔ لیکن معاویہ کی بد عہدی کا جرم امام حسن کی دیانت پر نہیں عائد ہو سکتا۔

سرور کائنات کی صلح کے مصالِح نہ سمجھنے پر لوگوں کی چہ می گوئیاں، رسول کا کبیدہ خاطر ہونا، اصحاب کا شک، رنجیدگی اور شاکی ہونا اس پر آنحضرت کا اصحاب کو اپنی نبوت، عصمت، اطاعت خدا، نصرت پروردگار کی طرف متوجہ کرنا، اور آخر کار مصالِح صلح کا آشکار ہو جانا کسی اور تائید کا

محتاج نہیں۔ امام حسنؑ کی صلح اگر سرور کائناتؐ کی صلح کو پیش نظر رکھ کر دیکھی جائے تو ذرہ برابر جائے کلام نہیں۔ کلام کرنے والا اسی فہرست میں رکھا جائے گا جس میں وہاں کلام کرنے والے رکھے جاتے ہیں۔ کفار سے نبیؐ کا صلح کرنا جب ناجائز نہیں ہے تو معاویہ سے حسنؑ کی صلح کیونکر قابل اعتراض ہو سکتی ہے۔

## امیر المومنینؑ کی صلح یا واقعہ حکمین

چونکہ یہ حصہ صرف مدعیان تشیع کی تسکین کے لیے لکھا جا رہا ہے اس لیے مزید اطمینان کے لیے امیر المومنینؑ کی صلح کا حال لکھنا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے اس طرح ایک دوسری نظیر بھی مل جائے گی اور ان اسباب و علل پر بھی کچھ اطلاع ہو جائے گی جنہوں نے امام حسنؑ کو صلح پر مجبور کیا۔ اس صلح کی پیشینگوئی تو رسول خداؐ ہی نے کر دی تھی۔ چنانچہ صلح معاویہ کے وقت ویسا ہی ہوا۔

اگر رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات اور اہلبیتؑ کے حقوق کا خیال مسلمانوں کو ہوتا تو تاریخ اسلام کچھ اور ہی ہوتی۔ قرآن و عترت سے تشک کی تاکید اور پھر امام محمد باقرؑ، امام جعفر صادقؑ، امام موسیٰ کاظمؑ کے رہتے ہوئے دینی مسائل کا مرکز امام ابو حنیفہ کو بنایا جانا کس منطق کا کام ہے۔ اسی ایک مثال سے دوسرے احکام و حالات پر غور کرنے کا کافی موقع ہے۔

سرور کائناتؐ کی زندگی ہی سے چکے مسلمانوں میں منافقین اس طرح گھس آئے تھے کہ عام نگاہوں میں تمیز مشتبہ ہو گئی تھی مگر قرآن مجید کے آیت

اور سرد کائنات کے احادیث پر نظر رکھنے والوں کے لیے مومنین اور منافقین کا پرکھ لینا کوئی دشوار کام نہ تھا اور نہ آج ہے۔ کفر، العمال وغیرہ میں ہے کہ:

۱۔ ”ہم لوگ زمانہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں منافقین کو اس طرح پہچانتے تھے کہ یا خدا اور رسولؐ کی تکذیب کرتے یا نماز نہ پڑھتے یا علی بن ابی طالبؑ سے دشمنی کرتے۔“

(ص ۵۳ منتخب کفر العمال کتاب الفضائل بر حاشیہ منہ بن خلیل ج ۱ طبع مصر)

۲۔ ”مسلم نے علیؑ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اس خدا کی قسم جس نے دانہ کو شگافتہ کیا اور صاحبان حیات کو پیدا کیا بے شک نبی امی نے مجھ سے کہہ دیا ہے کہ نہ دوست رکھے گا مجھے مگر مومن، اور نہ دشمنی کرے گا مجھ سے مگر منافق۔ اور ترمذی نے ابوسعید خدری سے روایت کی ہے کہ ہم لوگ پہچانتے رہے منافقین کو اس طرح کہ وہ لوگ علیؑ سے دشمنی کرتے تھے۔“ (صواعق محرقة ص ۲۲، حدیث، شتم فضائل علی علیہ السلام وخصائس نسائی ص ۱۹، مطبع خیر یہ مصر)

عام علامات کے علاوہ خود سرد کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منافقین کے نام بھی بتلا دیے ہیں، چنانچہ حذیفہ بن یمان صحابی کے متعلق مدارج النبوة میں ہے کہ:

”تعمیم کردہ بود آنحضرتؐ اور اصفا نفاق و دانا یدہ بود ذوات و

اشخاص منافقین و اسلئے ایشاں را کہ کدام اند“

اور احیاء العلوم میں ہے کہ ”کان یسأل (عمر) حذیفۃ ویقول انت

صاحب سر رسول اللہ فی المنافقین فہل تری علی شیءاً من آثار النفاق؟ (حضرت عرذیفہ سے پوچھا کرتے تھے کہ آپ منافقین کے متعلق رسول اللہ کے راز دار ہیں بھلا مجھ میں آثار نفاق میں سے کچھ پاتے ہیں؟)

بہر حال آنحضرتؐ کے وقت سے ہی مومنین اور منافقین خلط ملط ہو گئے تھے لیکن سرور کائناتؐ بمصالح شرعیہ کھلم کھلا ان پر کفار کا حکم جاری نہ فرماتے تھے۔ البتہ کبھی کبھی خود بخود ایسے لوگ نمایاں ہو جاتے تھے اور ایمان و نفاق کھل جاتا تھا۔ جنگ احد کے متعلق ابن خلدون کے مترجم حکیم احمد حسین صاحب الہ آبادی جلد سوم کے ص ۱۱۷ کے حاشیہ پر رقم طراز ہیں:

”ان واقعات کے دیکھنے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے صبر و تحمل و ثابت قدمی اور منافقوں کے لیے یہ لڑائی محکم کا حکم رکھتی تھی۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے ساٹھ آیتیں سورہ آل عمران کی اس کے حق میں نازل فرمائیں جس کی تفصیل کو ایک جڈاگانہ کتاب لکھنے کی ضرورت ہے۔ میرے نزدیک لڑائی کا عنوان بدل جانے کا اور کوئی ظاہری یا واقعی سبب اس کے سوائے نہ تھا جس کا تذکرہ اوپر ہو چکا ہے“

(صحابہ اور ان کا ایمان)

حکیم صاحب کی رائے سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ملاحظہ ہو قرآن مجید کی آیت ذیل جس میں بھاگنے والوں کے متعلق تذکرہ ہے:

”اے ایمان دارو! جب تم سے کفار سے میدان جنگ میں مقابلہ ہو تو (خبردار) ان کی طرف پیٹھ نہ پھیرنا، اور (یاد رہے کہ) اس شخص کے

سوا جو لڑائی کے واسطے کترائے یا جماعت کے پاس (جا کر) موقع پائے  
 (اور) جو شخص بھی اس دن اُن کفار کی طرف اپنی پیٹھ پھیرے گا وہ یقینی  
 (ہر پھر کے) خدا کے غضب میں آگیا اور اس کا ٹھکانہ جہنم ہی ہے اور  
 وہ کیا بُرا ٹھکانا ہے۔“

اور مشکوٰۃ شریف میں ہے:

”رسالت مآب نے فرمایا کہ سات چیزوں سے بچتے رہو؛ جو  
 ہلاک کر دینے والی ہیں۔ لوگوں نے دریافت کیا یا رسول اللہ! وہ کیا  
 ہیں؟ آپ نے جواب دیا شرک باللہ، سحر، ناحق نفسِ مہترم کا قتل،  
 سود خوری، مالِ شہیم کھانا، جنگ سے بھاگنا، بے گناہ محسنہ مومنہ کو زنا  
 کی تہمت دینا۔“ (یہ حدیث متفق علیہ ہے۔)

(مشکوٰۃ باب الکبائر وعلامات النفاق فصل اول مطبع گلزار محمدی

لاہور ۱۳۱۳ھ)۔

اس سے اندازہ ہو گیا کہ جنگ سے بھاگنا کیسا جرم ہے۔ جنگِ اُحد میں  
 مسلمانوں کا پلہ بھاری ہو کر پھر پانسہ پلٹ گیا۔ بھاگنے والے بھاگے اور جننے  
 والے ڈٹے رہے، زخمی ہوئے لڑے بھڑے اور جامِ شہادت نوش فرمایا۔  
 یہ مقام یاد رکھنے کا ہے کہ بقول ابنِ وردی پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ  
 وسلم ایک ہزار صحابہ کو ساتھ لے کر مدینہ سے باہر نکلے تھے۔

(ابنِ وردی ج ۱ ص ۱۱۸ مطبع وہبئہ مصر ۱۲۸۵ھ)

اور بقول صاحبِ حبیب السیر: ”ابتدا میں جب سپاہِ اسلام بھاگی تھی

تو سوائے مرتضیٰ کے مصطفیٰ کے ساتھ کوئی نہ رہا۔ ایک ساعت کے بعد عاصم بن ثابت اور ابو دجانہ اور سہیل بن حنیف اور طلحہ بن عبید اللہ آنحضرت کی خدمت میں پہنچے۔ بقول بخاری بارہ آدمی یا بقول دیگر مؤرخین زیادہ سے زیادہ چوگڑہ آدمی ثابت قدم رہے۔ (دیکھو تاریخ اسلام) غور کا مقام ہے، خود سرور انبیاء کا ساتھ ہے، گھر سے کچھ دور نہیں، کوئی خاص نمایاں شدت نہیں، پھر بھی ایک ہزار میں سے صرف بارہ یا چودہ مرد میدان نکلے، باقی سب نے پیٹھ دکھادی۔ اور یہ روایت حیاة القلوب، آگے چل کر جنگ تبوک کے موقع پر جو آخری غزوہ تھا جب سب شمار کیا گیا تو غلام اور نوکروں کے علاوہ پچیس ہزار نفری تھے مگر جب صاحبان ایمان شمار کیے گئے تو صرف پچیس نکلے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ کچھ مسلمانوں میں کچھ کس تناسب سے شامل تھے اور جب خود حضور کے سامنے یہ عالم تھا تو آپ کی آنکھ بند ہونے کے بعد تو علی الخصوص اہلبیت کے لیے عالم ہی دگرگوں ہو گیا تھا۔ جن لوگوں کے بل بوتے پر جنگ کی جاتی ہے وہ کل بیعت کرنے والے اور ساتھ نکلنے والے لشکریوں میں کتنے واقعی اور کتنے دورنگے ہوں گے۔ مختصر یہ کہ کھرے کھوٹے کی پرکھ قائم کر دینے والی یہ جنگ ہوئی اور جو کچھ ہوا اس سے تو تاریخ اسلام کے ورق سیاہ ہیں۔ جنگ میں پوری پوری شکست ہوئی۔ خود قرآن پاک واقعات کی سچی شہادت بہ آواز بلند دے رہا ہے۔ یہ سب ہوا مگر نہ تو رسول خدا نے ان اصحاب کو اپنی جمعیت سے باہر نکالا نہ ان پر آئندہ کے لیے حکم کفر جاری فرمایا بلکہ خونِ جگر پی کر رہ گئے۔ ایسے مشاہدات کے باوجود جب تمہیں آئندہ موقع ہوا تبھی کو دعوتِ جہاد دی،

اور جو ساتھ ہو لیا چاہے اندر سے جیسا بھی رہا ہو ساتھ لے لیا۔ غالباً اب بالکل واضح ہو گیا ہو گا کہ عہد رسالت سے ہی مدعیانِ اسلام میں اہلیت کے دوست و دشمن، مومن و منافق، کھرے اور کھوٹے، قابل و ثوق اور ناقابلِ اعتماد مخلوط تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا آنکھ بند کرنا تھا کہ آپ کی ذریت پر مصیبت کا ہاتھ پھٹ پڑا اور ایسے دردناک مظالم و شدائد کی بارش ہوئی جس کی نظیر پیش کرنے سے تاریخِ عالم قاصر ہے۔ اولاً جہالت، ثانیاً ناجائز پروپیگنڈے کی شکار دنیا پیتل کو سونا بلکہ راکھ کو کیما سمجھنے لگی۔ سازش اور گہری سازش پہلے سے کام کر رہی رہی تھی نتیجہ ظاہر ہے کہ معدنِ نبوت کے جو اہر پاروں کو تاج سر بنانے کے عوض خاکستر قید و حبس میں ڈھانک دیا گیا۔ سرور کائنات کی عترت اور آپ کے کلہ گویوں کی داستانِ عبرت سے پڑھنے والوں کی روح لرز جاتی ہے اور ایک باحیثیت مسلمان انصاف پسند انسانوں کے سامنے سوائے سر جھکا لینے کے اور کوئی چارہ نہیں پاتا۔ خاتم الانبیاء کا انتقال ہوتا ہے اور آپ کی ذریت کا یہ حال ہوتا ہے کہ کسی کے گلے میں پھندہ کسی کے جسمِ اقدس پر ڈرہ، کسی کو زہر بلاہل اور کسی کو خنجر قاتل، کسی کو قید سلسل و زنجیر، کسی کو نیزہ و شمشیر۔

ع : غرض بیانِ غمِ اہلیت آساں نیست

رسولؐ کا جنازہ گھر میں پڑا ہے، اہلیت روپیٹ رہے ہیں۔ مگر سقیفہ بنی ساعدہ میں کچھ اور ہی سامان ہو رہا ہے آج اسے جس نام سے پکارا جائے، اس کی جیسی دلفریب تصویر کھینچی جائے مگر اتنا ضرور سمجھا جاتا ہے کہ رسولؐ کی تجہیز و تکفین کی اہمیت مسلمانوں کے دل میں کتنی تھی اور آپ کی محبت کا تقاضا کیا تھا، اور

اگر سیفہ کی کارروائی نہایت اہم اور احسن تھی تو عدم شرکت جنازہ پر عمری قلق نری پر وہ پوشی ہی کہی جائے گی۔ رسول کے احتضار سے انتقال تک اور انتقال سے تجہیز و تکفین تک کیا ہوا، کیونکہ ہوا، اس دردناک داستان کو یہاں دہرانا مقصود نہیں۔ کہنا یہ ہے کہ حضرت علیؑ انا حق بھذا الامر منکم اور لسریع ما کذبتم علی رسول اللہ (کتاب الامامة والیاسة، ج ۱، ص ۱۲ و ۱۳ مطبع ادبیہ مصر ۱۳۳۱ھ) کہتے ہی رہے مگر حق کی آواز ہر طرف سے ٹھکرادی گئی اور اس طرح علی الاعلان رسول کے "فرمان تمک بہ اہل بیت" کی بنیاد کھیر پھینکی گئی۔ ایک لاکھ سے زیادہ اصحاب موجود تھے، کتوں نے یہ آواز اٹھائی کہ رسول کے بعد تمک کے لیے قرآن و اہلبیت میں نہ کہ قرآن و صحابہ؟۔ سعودی نے لکھا ہے لما بویع ابو بکر یوم السقیفة خرج علیؑ فقال افسدت علینا امورنا ولم تستشروا ولم ترع لناحقا فقال ابو بکر بلیؑ ولكن خشیت الفتنة یعنی جب یوم سقیفہ ابو بکر کی بیعت کی گئی تو علیؑ نے ابو بکر سے جا کر کہا کہ تم نے ہمارے امور کو تباہ کر دیا، ہم کو پوچھا تک نہیں اور ہمارے حق کی رعایت و نگہداشت مطلقاً نہ کی۔ ابو بکر نے کہا کہ یہ سب صحیح ہے مگر میں فتنہ سے ڈر گیا۔ (سعودی بر حاشیہ نفع الطیب ج ۱، ص ۲۲۱ طبع مصر)۔ خود بخاری کتاب المغازی باب غزوة خیبر ص ۳۶ جلد سوم مطبع مبینہ مصر ۱۳۲۰ھ کی وہ مشہور حدیث جس میں جناب سیدہ علیہا السلام کا میراث طلب کرنا اور نہ ملنا، اس پر آپ کا رنجیدہ ہونا، پھر مرتے دم تک ابو بکر صاحب سے ترک کلام وغیرہ مذکور ہے۔

اُس کا ایک جُزیہ بھی ہے کہ حضرت علیؑ نے فرمایا ہے کہ کننادری فی هذا الامر نصيبا فاستبد علينا فوجدنا في انفسنا يعني ہم اس امر خلافت میں اپنا ہی حق جانتے تھے لیکن ہمارے خلاف اس استبداد سے کام لیا گیا جس سے ہمارا جسگر کباب ہو گیا۔ ازیں قبیل کیا کچھ نہ کہا۔ مگر وہاں تو بقول امام غزالی حکومت و ریاست فانی حاصل کرنے کے لیے خواہش نفسانی غالب آپ چلی تھی۔ ایسی ریاست عظیمہ کا ہاتھ آنا اور تمام دیار و امصار میں خلافت کے جھنڈے کا گرنا جانا، علم کے پھر ہروں کا ہوا میں اڑنا اور ہوا کے ساتھ بیرقوں کا لہرانا دو طرفہ جلوس میں سواروں کی ہمراہی، گھوڑوں کے ٹاپوں کی آوازیں ملکوں اور شہروں کا فتح ہونا۔ ان سب خیالات نے ان لوگوں کو خواہش نفسانی کا جام پلا کر مدہوش کر دیا تھا اور اسی مخموری میں وہ خلیفہ بن گئے۔ (سر العالمین مقالہ رابعہ ص ۹ مطبوع بمبئی ۱۳۱۴ھ جب رسول ہی کی محبت اتنی تھی کہ مصطفیٰؐ اربے کفن بگذاشتند تو اس جماعت سے علیؑ کی ہمنوائی کی کیا توقع ہو سکتی ہے۔

علامہ ابن ابی الحدید معتزلی نے لکھا ہے :

”امیر المؤمنین کا قول لیس لی معین الخیر تو ایسی بات ہے جسے آپ ہمیشہ ہی کہا کرتے تھے اور یہ موقع آپ کے، بعد وفات رسولؐ فرماتے کا ہے۔ آپ یہ فرمایا کرتے تھے کہ کاش مجھے چالیس ارادے کے پکتے بل جاتے (تو میں مخالفین کو مزہ چکھا دیتا) اس کو نصر بن مزاحم نے کتاب صفین میں اور بھی بہت سے صاحبان سیرت نے نقل کیا ہے۔“ (دیکھو ابطال الباطل جلد ۱ ص ۱۲۲، ذیل خطبہ فنظرت فاذا لیس لی معین الاہلبیتی الخ)

جو لوگ واقعہ سقیفہ کے جواز کی توجیہیں کرنا چاہتے ہیں وہ جناب امیرؓ کے ہوا خواہوں کی تعداد بڑھانے میں بڑے انہماک سے کام لیتے ہیں۔ لیکن زبانی جمع خرچ اور چیز ہے اور واقعیت اور چیز ہے۔ کلمہ پڑھ لینے والے کو مسلمان ضرور کہا جاتا ہے مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ پوری جان بازی اور حقیقی سرفروشی کے مظاہرہ میں بھی ایسوں پر بھروسہ کیا جائے۔ اُحد کا ذکر ابھی اس کا شاہد عادل گزرا۔ اسی طرح امیر المؤمنینؓ کی حقیقت کا اگرچہ ظاہری اقرار بھی ہو مگر واقعی تن، من، دھن سے علیؓ کا ہونا ناجن کے بھروسہ پر کسی جنگی کارروائی کا خیال ہو سکے ایسوں کی تعداد بقول خود حضرت کے چالیس تک بھی نہ پہنچتی تھی بلکہ جس وقت کا یہ واقعہ ہے امیر المؤمنینؓ کو ایسے چالیس تو کیا پانچ بھی نہ ملتے تھے، جس کی تصریح علامہ ابن ابی الحدید نے اس طرح کی ہے :

”اور بیان کیا گیا ہے کہ جو کچھ بروز سقیفہ ہوا۔ اس کے بعد جب حضرت علیؓ نے مسلمانوں سے اپنی مدد چاہی جس کی صورت یہ ہوئی کہ رات کے وقت جناب سیدہؓ کو دراز گوش پر سوار کر کے حنین کو آگے لیے ہوئے آپ انصار اور دوسرے لوگوں کے مکانوں پر جاتے اور ان سے مدد و معاونت چاہتے اس پر رات کو تو چالیس شخصوں نے وعدہ کیا اور مرجانے کی بیعت کی۔ آپ نے کہا کہ سویرے سرمنڈا کر آجانا اور سلاح ہمراہ لانا۔ جب صبح ہوئی تو سوائے صرف چار کے کوئی بھی نہ آیا۔“

(ملاحظہ ہو ابن ابی الحدید جلد ۳، ص ۵ ذیل لناھضت القوم)

اسی طرح پے درپے تین راتیں گزریں، رات کو وعدے ہوتے اور صبح کو وہی چار

کے چار۔ اور بروایت رجال کثی مہاجرین و انصار خلافت آپ کا حق ہونے کا اقرار کرتے، ساتھ ہو کر جان دینے کا وعدہ کرتے مگر صبح کو صرف تین بزرگ دکھائی دیتے۔ صاحبان انصاف غور کریں کہ دل و جان سے اہلبیت پر قربان ہونے والوں کی تعداد کیا تھی (اس موقع پر واقعہ بیعت رضواں پیش نظر رکھنا چاہیے، کتنوں نے بیعت کی تھی اور رسول پر واقعی اعتماد کتنوں کو تھا، آگے بڑھ کر یہ بھی نہ رہا۔ اگرچہ حکومت ظاہری مل چکی تھی وہ تمام لوگ جو خلیفہ ثالث تک کے زمانہ میں خلفاء کی رعایا میں شمار ہوتے تھے یہاں بھی ایسا ہی سمجھا جا رہا تھا بلکہ ہزاروں کی تعداد میں لوگوں نے اپنی مرضی سے بلا جبر و اکراہ آپ کی بیعت بھی کر لی تھی مگر حال یہ تھا کہ:

”حضرت علی سے مروی ہے کہ آپ منبر کو نہ پر باغیوں سے جہاد کے لیے لوگوں کو دعوت دیتے تھے تو کسی نے جواب نہ دیا صرف دو آدمیوں نے وعدہ کیا۔ آپ نے ٹھنڈی سانس بھر کر ان کے لیے دعا کی اور فرمایا کہ جو میرا ارادہ ہے اس میں تم دوسے کیا کام چل سکتا ہے“

(کشاف ج ۱ ص ۲۰۹ طبع بولاق ماخذہ ص ۴)

مذکورہ بالا واقعات سے اچھی طرح سمجھ میں آسکتا ہے کہ اہلبیت رسول کی قدر اور ان کے حقوق کا احترام بلکہ رسول خدا کا احترام ان مسلمانوں کے دل میں کیا تھا اور ظاہر کیا کرتے تھے۔ کیا اسی بے پروبالی کے عالم میں جنگ مناسب ہوتی ہے خصوصاً جب یہ بھی ملحوظ رہے کہ علی کے ساتھ تو یہ برتاؤ اور دوسری طرف یہ رنگ کہ مالک ابن نویرہ غریب کو بالکل بے گناہ قتل کیا جائے، اس کی بیوی سے اسی روز زنا کی جائے اور کوئی پُرسانِ حال نہ ہو (تاریخ اسلام، بلکہ خالد ص ۱۰۰)

اٹے سیف اللہ کا خطاب پائیں۔ سعد بن عبادہ کی جان شام تک میں جا چھینے کے باوجود نہ بچے۔ حضرت عمرو ہاں آدمی بھیج کر مرداڈ الیٰس وغیرہ۔

غرض یہ سلسلہ ہر روز دراز تر ہوتا گیا اور حضرت علیؑ موقع موقع سے جہاں تک دین کی حفاظت ممکن تھی کرتے رہے اور اپنے حقوق جتاتے رہے۔ چنانچہ جب حضرت عثمان کی خلافت مانی گئی اس وقت پھر آپ نے کھلم کھلا یہ اپنا حق ظاہر فرمایا:

”کچھ آج پہلادن تو نہیں کہ تم لوگوں نے ہم پر تغلب کر لیا۔ اب صبر جمیل ہے اور جیسا تم کہتے ہو اس کے برخلاف ہم اللہ ہی سے مدد چاہیں گے“

(دیکھو ابوالفداء ج ۱ ص ۱۶۶ طبع مصر)

مختصر یہ کہ اہل بیت کے خلاف مسلسل سازشوں کا سلسلہ منقطع یا کمزور ہونے کے بجائے روز بروز بڑھتا اور مستحکم ہوتا رہا، لیکن اہلبیت نے جن کو دین خدا سے زیادہ عزیز تھا ایک طرف تو ان شہداء و مصائب پر صبر کیا جو مخالفین کی طرف سے ہوتے رہے دوسری طرف آہستہ آہستہ اپنے حقوق کا اثبات اپنے معجزات، انجاء بالغیب، مافوق العادۃ تحمل مظالم، بدلیل نشر آیات و احادیث، خلق حسن، غرض اتنے مکمل علمی و عملی کام نمونہ رسول ہونے کے ذریعہ کرتے رہے اور دنیا اس مطمح نظر اور مقصد اصلی کی تلقین اور تبلیغ کرتے رہے جو رسول کی غرض بعثت تھی اور جو چپکے سے مرجانے اور فنا ہو جانے سے ہرگز پوری نہ ہو سکتی اور بجمل

جنگ نہ کر کے مظلوم رہ کے اپنے مخالفوں کو ظالم اور قولاً و فعلاً تعلیم رسول کا مخالف ثابت کر کے صاحبانِ بصیرت انصاف کی نظر میں شکستِ فاش دیتے رہے۔

جب دنیا نے تعلیماتِ رسولؐ اور واقعات کو اس طرح چھپایا مٹایا اور پس پشت ڈال دیا تھا کہ علیؑ الاعلان حضرت علیؑ کے برادرِ رسول ہونے سے انکار کیا جاتا ہے (کتاب الامتہ والسیاستہ) اور کسی مدعی اسلام کے کان پر جوں نہیں رہتی۔ آیاتِ قرآنیہ کو من مانی باتوں سے رد کیا جاتا ہے اور باوجود فاطمہؑ و علیؑ حسنؑ و حسینؑ و ام ایمن کے اتفاق و شہادت کے میراثِ انبیاء سے انکار کیا جاتا ہے اور جب دل چاہتا ہے کسی کو کچھ دے کر اس کا نام تبرک رکھا جاتا ہے اور کسی مدعی اسلام کے منہ میں زبان نہیں ہوتی جو لوٹکے۔ آیتِ قرآن کو بلا کسی آیت کے منسوخ فرمایا جاتا ہے اور کسی کا چوں و چرا کرنا کیسا آمتا و صدقنا کر لیا جاتا ہے۔ نافلہ نمازیں جماعت کے حرام ہونے کے باوجود اس کی ایجاد ہوتی ہے اور اس کو بدعتِ حسنہ کہہ کر قابلِ تسلیم فرض کیا جاتا ہے۔ رسولؐ کے وقت کی اذان میں ترمیم ہوتی ہے اور کوئی کچھ نہیں بولتا یا بول سکتا وغیرہ وغیرہ۔ ان حالات میں اگر امیر المؤمنینؑ جنگ کر کے مرجلتے یا سعد بن عبادہ کا سا جوشِ ظاہر کرتے آپ کے واسطے بھی قاتل جن تیار کر دیا جاتا۔ تو نہ علیؑ رہتے نہ حسنؑ نہ حسینؑ ہوتے نہ باقی ائمہؑ، اور اس طرح آج تعلیمِ رسولؐ دنیا سے یک قلم خالی ہو جاتی۔ وہ تمام علومِ شریعت زیرِ خاک ہو جاتے جو مصائبِ برداشت کر کے تیس سال میں امیر المؤمنینؑ نے دنیا تک پہنچائے اور جن کا باغِ مخلصین کے سینوں میں لگا گئے اور جو رفتہ رفتہ سرسبز ہوتا گیا جس کی باغبانی علیؑ کی گیارہ پشت تک مسلسل ہوتی رہی اور وہ اہلبیت جن کا نام و نشان مٹانے

کی قسم کھائی گئی تھی آج ان کی نسل اور ان کے ارشادات سے مشرق و مغرب عالم فیضیاب ہو رہا ہے۔ (واقعہ کو مثال سے سمجھئے)

ناظرین کے اذہان میں مزید استحکام کے لیے اس موقع پر ایک مثال لکھی جاتی ہے اور انصاف طلب ہوں کہ آیا علیؑ کی زندگی اور زندہ رہ کر دین خدا کی حفاظت کے مواقع نکالنا اور وقت پر نہ چونکا دین اسلام کی ہجرت اور ترویج حق و حقیقت اس کی بقا و استحکام کا سبب تھی یا بے یار و انصار صرف ان چند با اخلاص اہل بیتؑ و انصار کو لے کر میدان جنگ میں آنا، لڑا کر جان بے دینا اور اپنی قبر میں اپنے ساتھ ان حقائق کو دفن ہو جانے دینا جو اللہ سے لے کر ستمہ تک مختلف عنوان سے ظاہر ہوتے رہے اور اتنی دور تک پھیل گئے کہ بعد کا یلغار ان سب کو دبایا یا فنا نہ کر سکا۔

مثال یہ ہے کہ ایک مرتبہ دو عورتوں نے حضرت عمر کے دربار میں ایک ہی لڑکے کے بارے میں دعویٰ کیا۔ ہر ایک کہتی تھی کہ لڑکا اس کا ہے، اور نہ کوئی تیسرا مدعی تھا نہ ان دونوں کے پاس کوئی گواہ تھا۔ حضرت عمر کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا فیصلہ کریں۔ آخر حضرت علیؑ کی طرف رجوع کی۔ آپ نے ان دونوں کو بلوا کر پہلے تو بہت سمجھایا بھجایا، ڈرایا دھمکا یا مگر انہوں نے ایک نہ سنی۔ آخر جب ان کا جھگڑا ختم نہ ہوا تو آپ نے آ رہ منگوایا۔ اب تو دونوں عورتیں بول اٹھیں کہ کیا کیجئے گا؟ آپ نے فرمایا کہ نہ مانو گی تو پھر اس لڑکے کو دو ادھے کر کے آدھا آدھا دونوں کو بانٹ دوں گا۔ یہ سن کر ایک تو چُپ ہو گئی، مگر دوسری چیخنے لگی کہ خدا کا واسطہ اے ابوالحسن! اگر یہی ہونا ہے تو میں اس

بچے کو اس عورت کو دیے دیتی ہوں۔ یہ سننا تھا کہ آپ نے آواز تھیکر بلند کی، اور فرمایا کہ بس لڑکا تیرا ہی ہے اس کا نہیں ہے، کیونکہ اگر اس کا ہوتا تو اٹھنے دیکھ کر اس کا دل ضرور تڑپ جاتا۔ اب دوسری عورت نے بھی مانا کہ بیشک لڑکا پہلی ہی کا ہے، اُس (دوسری) کا نہیں ہے، پہلی ہی سچ کہتی تھی۔ یوں حضرت عمر کی مشکل بھی حل ہوئی، بلکہ اپنی اس مشکل کشائی پر حضرت عمر نے امیر المؤمنین کو دعائیں بھی دیں۔

دیکھئے بمقتضائے فطرت جو ماں نہ تھی اُسے پرواہ بھی نہ ہوئی کہ لڑکا رہتا ہے یا مرتا ہے، مگر جو حقیقتاً ماں تھی بچے کے چیرے جانے کے خیال ہی سے تڑپ گئی۔ اس میں شک نہیں کہ اگر بچہ دو ٹکڑے ہو جاتا تو جھوٹی دعویٰ سے دار کو بھی کچھ نہ ملتا مگر اس کا کچھ کھو بھی نہ جاتا۔ لیکن اس سے اس پر کیا اثر پڑتا تھا بخلاف اس کے واقعی ماں کو اضطراب ہوا اور اس پر راضی ہو گئی کہ اس کی گود خالی ہی سہی، اور دل پر ناگوار ہی سہی بچہ تو سلامت رہے۔ دوسری ہی گود میں رہ کر زندہ تو رہ جائے چاہے اُس کی تربیت ماں کی سی نہ بھی ہو۔ جب بڑا ہوگا، عقل و ہوش سنبھالے گا تو اُسے اور اہل عالم کو خود ہی معلوم ہو جائے گا کہ وہ کس کا فرزند ہے اور اس کی ماں کون ہے اور ڈان کون۔ یوں ہی اہلبیت کو خیال کیجئے جب وہ یہ دیکھتے کہ اسلام کا عین و اثرب گم ہوا چاہتا ہے تو اتنے پر صبر و شکر کر لیتے کہ کم از کم نام تو زندہ رہے۔ ہم آہستہ آہستہ اس کی روح بھی دنیا کے سامنے پیش کر لیں گے۔ ابھی زبان سے کلمہ کھلا انکار نہیں ہے لا الہ الا اللہ اور محمد رسول اللہ کا

زبانی اقرار ہے۔ پھر کوئی نہ کوئی ایسا بھی ہو جائے گا جس کے دل میں بھی اُتر ہی جائے گا۔ دیکھو خود رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وقت میں مولفہ اقلوب تھے مگر باوجود باطنی کفر کے زکوٰۃ میں سے ان کا بھی ایک حصہ جس کا فائدہ یہ تھا کہ کم از کم ان کے اور ان کے ہم مشربوں کے شر سے محفوظ رہے۔

قالت الاعراب انا قل لعمومنا ولكن قولوا اسلمنا ولما ايدنا الايمان في قلوبكم۔ اس سے واضح ہے کہ اعراب کے دل میں باوجود ایمان نہ ہونے کے صرف زبانی اقرار سے ظاہری اسلام کا حکم ان کے جاری تھا، اسی طرح تباہی رسول آل رسول بھی مصانہ اور مدارا سے کام لے۔ شدتیں جھیلتے اور دین کو اپنی ملکیت جان کر فنا کے جھونکوں سے محفوظ رکھتے رہے اور جو لوگ دین کے نام پر دنیا حاصل کرتے چونکہ ان کا مطلوب دنیا ہوتی ہے تک استحصال دنیا میں اظہار دین میں ہوتا اظہار دین کرتے اور جہاں پر دین کی پابندی سے دنیا چھوٹی نظر آتی وہاں دین کو سراسر پس پشت ڈال دیتے۔

واقعات کی اجمالی تصویر کشی میں بھی اتنا طول ہو گیا، لیکن غالباً اب صاحب فہم کو اس میں شک نہ باقی رہا ہو گا کہ رسول کے بعد اہلبیت رسول کے ساتھ دنیا کا کیا رنگ تھا۔ پھر امام حسنؑ آتے آتے کیا حالات ہو چکے ہوں اور آپ کو کس درجہ مجبوری رہی ہوگی، نہ جائے مائدن نہ پائے رفتن کی صورت نہ لڑ جانا ہی مفید تھا۔ کیونکہ ناصر و معین ندارد، نہ ایک دم بے تعلق ممکن تھی۔ پھر اصلی تعلیم رسول و حقوق اہلبیت کی طرف سے بالکل ہی غفلت ہو جاتی ہے۔ بہر حال ابھی ہم دوسرے واقعات سے بحث نہیں کرنا چاہتے ابھی تو یہ دیکھا

ہے کہ حضرت امیر علیہ السلام کو بھی مجبوری ہوئی تھی کہ صلح کرتے، وہ کیا تھی اور کیوں تھی تاکہ اسی پر امام حسنؑ کی صلح کا قیاس نتیجہ خیز ہو جائے۔

## اضافت کی غلطی عقیدہ کی صورت :

ابو بکر صاحب دو سال اور چند ماہ کی مختصر سی حکومت کر گئے۔ مگر ایسی جڑ قائم ہو گئی کہ خلافت نبویہ نے حکومت ذیویہ کی پوری پوری حیثیت اختیار کر لی، اور جو شخص اس موقع پر غلطی کا شکار ہو گیا اس کو اس پھندے سے نکلنا دشوار ہو گیا۔ سرور کائنات کے بعد جتنی حکومتیں ہوئیں سوائے ایک کے ہرگز ان کو اسلامی حکومت نہیں کہا جاسکتا ہاں وہ مسلمانوں کی حکومتیں کہلا سکتی ہیں۔ اس لیے کہ اسلامی توجب ہوں کہ قوانین اسلامیہ قرآنیہ اور سنن نبویہ دستور العمل ہوں یھلا رسول اللہ کی حکومت اور قیصر و کسریٰ کا معیار یہ تو اسلام کی کھلی ہوئی توہین ہے۔ اگر بعد رسول حضرت ابو بکر کو خلیفہ رسولؐ نہ کہا جائے اور صرف مسلمان بادشاہ کہا جائے تو یقیناً شیعہ، سنی زاع بالکل ختم ہو جاتی ہے۔ مگر مصیبت کا دروازہ تو اُسے الہی کہہ کر کھولا جاتا ہے بلکہ اس دن سے آج تک کی تمام خانہ جنگیوں کی بنا اس خلافت کو دینی حکومت اور حکومت الہیہ کہنا ہے۔ اگر اہل سنت اپنی کتاب کی اس روایت کو غور سے پڑھیں تو شاید مشکل دور ہو جائے۔ ملا قبض النبیؐ نظرنا فی امرنا فوجدنا النبیؐ قد قدم ابا بکر فی الصلوٰۃ فرضینا لدینانا ما رضیۃ النبی لدیننا۔ یعنی جب آنحضرتؐ کا انتقال ہوا اور ہم لوگوں نے اپنے بارے میں غور کیا تو یہ دیکھا کہ نبیؐ نے ابو بکر کو نماز میں آگے

کیا ہے، تو اب ہم لوگوں نے "اپنی دنیا" کے واسطے اس کو پسند کیا جس کو نبیؐ نے ہمارے دین کے لیے پسند کیا تھا۔

کیوں نہ اس روایت کی روشنی میں حضرت ابو بکر کی حکومت کو دنیا کی حکومت مان لیا جائے۔ جانے کو تو یہ حکومت جلد ہی چلی گئی لیکن ممالک مفتوحہ و مقبوضہ پر کیا اثر پھوڑ گئی اس کا اندازہ لگانے کے لیے ایک نظر بعض بعض حکام اور علاقہ پر بھی ڈالنا ضروری ہے اور خصوصیت سے شام کے حالات مزید احتیاط سے دیکھے جانے کے لائق ہیں۔ خلافت اولیٰ میں خالد بن ولید حاکم شام تھا اور حضرت عمر کے وقت بقول طبری کو ذمہ میں مغیرہ بن شعبہ، بصرہ میں ابو موسیٰ اشعریٰ، مصر میں عمرو بن العاص اور بقول ابن خلدون شام میں ابو عبیدہ (عشرہ مبشرہ کی فہرست پر نظر ڈالو)، اور معاویہ اور اس کا بھائی یزید بن سفیان، کو ذمہ میں سعد بن ابی وقاص، طائف میں عثمان بن العاص حضرت ابو بکر ہی کے وقت سے عامل تھے، حمص کا حاکم خلافت ثانیہ میں عمر بن سعد تھا۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان مقامات میں اور ان عمال کے زیر اثر اہلبیت کے حقوق کا کیا حال کر دیا ہوگا۔ یہ تو تھا ہی، اس کے بعد عثمان صاحب کا زمانہ آیا تو ایسا اندھا دھند کارخانہ اُمیہ شاہی چلا کہ دشمن دوست سب ہی چلا اُٹھے، آپ کے زمانہ کے بعض عمال کا نام بھی ملحوظ رہے تو حالات کے سمجھنے میں اور آسانی ہوگی۔ بصرہ میں عبداللہ بن عامر، شام میں معاویہ ابن ابی سفیان اور پھر معاویہ کی طرف سے حمص میں عبدالرحمن بن خالد، اردن میں ابوالاعور سلمیٰ، کو ذمہ میں ابو موسیٰ، آذربائیجان میں اشعث بن قیس کندی، مصر میں عبداللہ بن سعد بن ابی سرح۔

دعاویہ کی طرف سے ان حکام کی تعیین کا مطلب یہ ہے کہ ان مقامات کے متعلق دربارِ خلافت سے معاویہ کو حاکم معین کرنے کا اختیار سپرد تھا، یہ تو ابتدائی دور تھا، آتے آتے آخری زمانہ ایسا آیا کہ پیمانہ پھلک گیا۔ مثل مشہور ہے تنگ آمد بہ جنگ آمد، لوگوں نے دھاوا بول دیا اور خود اصحاب و تابعین کے گروہ نے حضرت عثمان ہی کا خاتمہ کر دیا۔ جو بیس پچیس سال میں اہلبیت کے خلاف کیا رنگ کھیلا گیا ہوگا۔ اتنے مختصر لفظوں میں ہرگز ادا نہیں ہو سکتا، جس حکومت کی مشین میں ایسے پُرزے لگے ہوں جن کے متعلق شبلی صاحب (اپنا مطمح نظر ملحوظ رکھتے ہوئے) یہ تحریر فرماتے ہیں:

”یہ عموماً مسلم ہے کہ جوہر شناسی کی صفت ان میں (حضرت عمرؓ) سب سے بڑھ کر تھی۔ اس ذریعہ سے انھوں نے تمام عرب میں قابل آدمیوں اور ان کی مختلف قابلیتوں سے واقفیت پیدا کی تھی اور انہی قابلیتوں کے لحاظ سے ان کو مناسب عہدے دیئے تھے۔ سیاست و انتظام کے فن میں عرب میں چار شخص اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے۔ امیر معاویہ، عمرو بن العاص، مغیرہ بن شعبہ، زیاد بن سمیہ۔ چنانچہ ان سب کو بڑی بڑی ملکی خدمتیں سپرد کیں اور درحقیقت ان لوگوں کے سوا شام و مصر و کوفہ پر اور کوئی شخص قابو نہیں رکھ سکتا تھا“ (الفاروق ج ۲، ص ۱۵۳، قومی پریس دہلی ۱۹۰۵ء)

شبلی صاحب نے دہاکہ کا ترجمہ ”سیاست و انتظام کا فن“ کیا ہے۔ ترجمہ صحیح ہو یا غلط، قابل دریافت صرف یہ ہے کہ ساری ”جوہر شناسی“ اور ”قابلیت“

کے باوجود یہ تو ارشاد ہو کہ ان قابل ہستیوں میں جو ہر شناس صاحب نے ”دین محمدی“ کا جزو کتنا پایا تھا، اور تو اور خود جو ہر شناس صاحب نے امیر معاویہ کے لیے کیا فرمایا تھا، امام نسائی و شافعی کے اقوال کیا ہیں۔ اس وقت مجھے ان تمام باتوں کی طرف توجہ دلانا نہیں ہے صرف یہ دکھلانا ہے کہ ایسے ایسے ”قابل آدمیوں“ کی حکومتوں میں اہلیت کا کیا حال ہو گا۔ ناظرین ان عمال کے اعمال کو احادیث و اخبار کی روشنی میں ایک دیانت دار مسلمان کی آنکھ سے ملاحظہ فرمائیں۔

شبلی صاحب نے تو یہ تصریح کر دی ہے کہ ”یہ بھی سچ ہے کہ انھوں نے اپنی خلافت کو نہ صرف انصار بلکہ بنو ہاشم اور حضرت علیؑ سے بھی بزور منوانا چاہا گو بنو ہاشم نے آسانی سے ان کی خلافت تسلیم نہیں کی (الفاروق ج ۱ ص ۵۲) جس سے واضح ہو گیا کہ یہ حکومت کس رنگ سے شروع ہوتی ہے اور اہلیت ابتدا ہی میں اس درجہ کمزور کر دیے گئے کہ ان سے حکومت بزور منوانے کی خواہش ہوئی اور بقول آپ کے مانی بھی گئی تو باسانی نہیں۔ تو آگے چل کر اس حکومت نے کیا گل کھلائے ہوں گے۔ نہ صرف اتنا بلکہ بنی ہاشم عہدوں سے محروم رکھے گئے۔ (الفاروق ج ۲ ص ۱۵۷) اور جناب شبلی آج بھی اس کی تاویل کی کرتے نظر آتے ہیں بلکہ ج ۱ ص ۵۷ الفاروق پر اس حد تک آگے ہیں کہ بنی ہاشم کی مخالفت کو ”سازش“ کی لفظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ”بنو ہاشم کی سازشیں اگر قائم رہتیں تو اسی وقت جماعت اسلام

۱۷ شبلی صاحب کہتے ہیں کہ ”بنو ہاشم کو بھی ملکی عہدے نہیں دیے اور اس میں زیادہ تر یہی مصلحت ملحوظ تھی۔“ (الفاروق ج ۲، ص ۱۵۲)

کا شیرازہ بکھر جاتا اور وہی خانہ جنگیاں برپا ہوتی ہیں جو آگے چل کر جناب امیر علیہ السلام اور امیر معاویہ میں واقع ہوئیں۔ افسوس اور تعجب تو اس پر ہے کہ جس خانہ جنگی کو معیوب اور خطرناک قرار دے کر نظیر پیش کی گئی ہے اُس کے بانی وہی جو ہر شناس، ٹھہرتے ہیں جنہوں نے ایسے ”قابل آدمی“ کو حاکم شام بنایا اور لطیفہ یہ کہ باوجود اس بُرائی کے جس کے ڈر سے بنی ہاشم کو سازشی کا خطاب دیا گیا۔ آج بھی وہ امیر معاویہ واجب الاحترام قرار لینے جا رہے ہیں۔

یہ تو عمال کی حالت اس طرح اہلیت اور ان کا خاندان کچلا گیا اور پھر املت لکم دینکم اور من لم یرحکم بما انزل اللہ ان احکم بھا اور اللہ وغیرہ آیات کے حکومت میں قدیم سلطنتوں کے قواعد سننا اور ان کو اسلام میں داخل کر کے سلطنت مخلوطہ کا رواج آل رسول کی حکومت اور ان کی حرف بہ حرف پیروی رسول اور حق و نیت پر سختی سے نچے رہنے کی عادت کے حق میں کیسا درخت لگا یا گیا وہ صاحبان بصیرت پر روز روشن کی طرح ظاہر ہے۔

لہ الفاروق ج ۲ ص ۱۵۴۔ ”حضرت عمر کی سیاست کا ایک بڑا اصول یہ تھا کہ وہ قدیم سلطنتوں کے اور حکمرانوں کے قواعد اور انتظامات سے واقفیت پیدا کرتے تھے اور ان میں جو چیزیں پسند کے قابل ہوتی تھیں اس کو اختیار کرتے تھے۔ خراج، عسور، دفتر رسد کا عذات حساب۔ ان تمام انتظامات میں انہوں نے ایران اور شام کے قدیم قواعد پر عمل کیا۔“

حضرت عثمان کا مارا جانا اور مسلمانوں کا اس وقت کا حال تاریخ داں حضرات سے مخفی نہیں۔ حضرت علیؑ کی بیعت کی گئی۔ کیوں اور کس طرح یہ داستان طویل ہے بہر حال بیعت کی گئی۔ آپ نے ہر چند لوگوں کو ٹالا آپ کو وصیت رسولؐ اور پچیس سال کے تجربات ظاہر بینوں کی اصطلاح کی بنا پر علاوہ خصوصی اور چشم دید حالات یہ بتا رہے تھے کہ ان لوگوں سے وفا کی کوئی امید نہیں۔ ہر شخص کا کوئی نہ کوئی ذاتی مطمح نظر ہے اگر وہ پورا نہ کیا گیا تو وہ ساتھ نہ دے گا۔

ادھر آپ اپنے علم و یقین کتاب خدا و سنت رسولؐ سے سرمو تجاؤز کرنے والے نہ تھے اسی خیال پر ثابث قدم تھے اور اسی کا ارادہ تھا، کسی کی ناخوش خواہش کو پورا کرنے والے نہ تھے، آپ کو دھوکا، فریب، عیاری، مکاری سے حکومت دنیاوی قائم کرنا نہ تھی۔ جس علیؑ نے باوجود اپنی حقیقت پر مکمل اعتماد کے بیعت شری میں کتاب خدا اور سنت رسولؐ سے ہٹنا گوارا نہ کیا، سیرت شیخین کی پیروی کا زبانی وعدہ پسند نہ کیا اور سلطنت پر لات ماردی، وہ اب جب خود لوگ آرہے تھے کتاب خدا اور سنت رسولؐ سے سرمو تجاؤز کا خیال دل میں کیوں کر لاسکتا تھا۔ انتقال رسولؐ کے وقت پچیس سال تک جن لوگوں کو آزادی کی مشق ہو چکی تھی ان پر کیا اعتماد ہو سکتا تھا چنانچہ آپ نے اس کو خوب خوب واضح کر دیا، لیکن اس وقت کی خلقت کچھ ایسی پھنس گئی تھی کہ علیؑ کے سوا اور کہیں پناہ کی جگہ ہی نہ تھی۔

طبری جلد ۵ ص ۵۶ کی عبارت ذیل اس موقع پر قابل ملاحظہ ہے :

”محمد و طلحہ کہتے ہیں کہ لوگوں نے کہا کہ اے اہل مدینہ! جو تم پر لازم

ہے اُسے اختیار کرو، ہم لوگ تمہیں دودن کی مہلت دیتے ہیں۔ اب اگر

تم (اپنے فریضے سے) فارغ البالی نہ حاصل کر سکتے تو پھر ہم لوگ علیؑ، طلحہ، زبیر اور بہت سے آدمیوں کو قتل کر ڈالیں گے۔ اب لوگ علیؑ پر ہر چہار طرف سے ٹوٹ پڑے اور یہ کہنے لگے کہ ہم لوگ آپ کی بیعت کرنا چاہتے ہیں آپ دیکھ رہے ہیں کہ اسلام پر کیا بلا آ پڑی ہے اور ذوی القربی کے باب میں ہمارا کیا ابتلاء ہوا ہے۔ اس پر علیؑ نے کہا کہ میرا بیچا چھوڑ دو کسی اور کو تلاش کرو۔ معاملہ یہ ہے کہ جو امور ہمارے سامنے ہیں اس میں کتنی باتیں اور کتنے رنگ ہیں جنہیں قلب برداشت نہ کر سکیں گے اور ان پر عقلیں جتنا گوارہ نہ کریں گی۔ اس پر ان لوگوں نے آپ کو خدا کی قسمیں دلانا شروع کر دیں اور کہنے لگے کہ کیا جو حالت میں ہم لوگ دیکھ رہے ہیں، کیا جو فتنہ برپا ہے اس سے آپ واقف نہیں ہیں، بھلا آپ خدا کا خون بھی نہیں کرتے۔ آپ نے فرمایا کہ میں نے جو جواب دیا ہے وہ اس بن پر ہے جسے میں دیکھ رہا ہوں (لیکن) خوب سمجھ لو کہ اگر میں تمہاری بات مانوں گا (بیعت پر راضی ہوں گا) تو تم کو ہمارے علم کے مطابق چلنا پڑے گا لہذا اگر تم مجھے چھوڑ دو تو پھر جیسے تم ہو ویسا ایک میں بھی ہوں گا (ہمارے علم کے مطابق چلنے چلانے کا کوئی سوال ہی نہ ہوگا)۔

مختصر یہ کہ ان حالات میں بیعت ہوئی اور ادھر بیعت کا پورا ہونا تھا اور

عین نے وسیلۃ النجاة ص ۱۸۲ میں لکھا ہے کہ باوجود آنکہ در حضرت علیؑ علیہ السلام رخ  
(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ادھر رنگ ہی دگر گوں ہو گیا۔ وہی لوگ جو حضرت عثمان کے قتل و کفر کے فتوے کر رہے تھے، عثمان کو مظلوم مقتول کہہ کے آمادہٴ پیکار ہو گئے۔ لطیفہ تو یہ کہ قاتل کوئی کچھ نہیں کہتا۔ حضرت علیؑ سے خون عثمان کی طلب ہے۔ ہر چند علیؑ نے صفا فرما دیا کہ نہ میں نے حکم قتل دیا نہ منع کیا۔ مگر دل تو کسی اور دھن میں تھے، بہا نکال کر ناکشیں نے بیعت توڑی اور جنگ کی ٹھان کر علیؑ پر چڑھائی کر دی۔ مزید طرہ یہ ہوا کہ علیؑ مرتضیٰ نے خلیفہ ہونے کے بعد سب سے پہلا جو کام کیا وہ کہ عثمان کے گورنروں کو حکم معزولی دے دیا لوگوں نے عموماً اور ابن عباس خصوصاً سمجھایا کہ یہ امر خلافت مصلحت ہے، ظلم و زبیر کا کوئی اعتبار نہیں اور خاتمہ معاویہ جو طالب جاہ و حکومت ہے اپنی معزولی کا حکم پا کر آپ کا دشمن ہو جا۔ اور یہ لوگ اہل شام اور اہل عراق کے اعتقاد کو بگاڑ کے آپ کو قتل عثمان متہم کریں گے ذرا اپنی خلافت کو جم جانے دیجئے بعد میں اس طرح نکال پھینکا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

قدم در سوابق اسلامیہ و وفور اوصاف خلافت خاصہ بود اما الفقار و بیعت و وجوب انقیاد فی حکم اللہ نسبت او ممکن نہ شد ہر چند مساعی جمید و مشقت ہائے جلیلہ بکار برد لیکن در خطا در اقطار ارض حکم او نافذ گشت و تمامی مسلمین تحت حکم او سر نیار و درند و افتراق کلمہ سلیم پیوست و ایٹلاف ایٹاں رخت بعدم کشید و مردم بحروب عظیمہ بدو پیش آمدند و دست او ملک کوتاہ ساختند و روز دائرہ سلطنت سیا بعد التحکیم منکر شدن گرفت تا آنکہ در آخر بحر کوہ آں برائے ایٹاں صافی نامند۔

جس طرح خمیر میں سے بال کو نکال پھینکتے ہیں۔ علی مرتضیٰ نے جواب دیا :  
 ”مصلحت دنیوی تو وہی ہے جو تم کہتے ہو مگر میری نظر عقلی

مصلحت دین ہے“

اور رعایت دنیا اگر بغیر رعایت دین کے کی جائے تو نہ دین رہتا ہے نہ دنیا :

دنیا مطلب تاہمہ دینت باشد

دنیا طلبی نہ آں نہ اینت باشد

اور ان گورنروں کی بے اعتدالیوں پر نظر کر کے فرمایا کہ ان گورنروں کی ناہنجاریا  
 حد درجہ کو پہنچ گئی ہیں، میں اُمتِ رسولؐ پر بڑے لوگوں کو حکمران نہیں رکھ سکتا۔

بندگانِ خدا کو ان تکلیفوں سے فوراً نجات دلانی چاہیے۔ (روضۃ الاحباب حبیب السیر طبری،  
 میفرہ کا وہ مشورہ جو قتل عثمان اور بیعت امیر المومنینؑ کے بعد پیش کیا گیا

تھا جس کو استیعاب ج ۱ ص ۲۵۹ پر نقل کیا گیا ہے قابل دید ہے اور اس میں  
 معاویہ کے لیے خصوصیت سے امیر المومنینؑ کے یہ الفاظ فلا واللہ لا ارانی

اللہ مستعلا لہ ولا مستعینا مادام علی حالہ (قسم بخدا کبھی نہ دیکھے گا  
 کہ میں معاویہ کو عامل بناؤں یا اس سے مدد لوں جب تک وہ اپنے حال پر

رہے گا، اور ان اقررت معویۃ علی مافی یدہ کنت متخذ المصلین  
 عضدا) جو کچھ معاویہ کے قبضہ میں ہے اگر میں اسی پر اُسے باقی رہنے دوں تو

میں آیت متخذ المصلین عضدا کا مصداق ہو جاؤں گا۔)

لے ایک علیؑ کا یہ نوٹ اس پر شبلی صاحب کا ”جوہر شناس“ قابل توجہ ہے۔

خلاصہ یہ کہ علی بن ابی طالبؑ ان گوزوں کی گوزری ذرا دیر کے لیے بھی برداشت نہ کرتے تھے اور اس کو گناہ اور صریح آیت خدا کی خلاف ورزی بتاتے تھے۔ بعض گوزوں کے نام اوپر مذکور ہو چکے ہیں ان کے اعمال و افعال پر نظر کر کے علیؑ تو بڑی چیز تھے۔ کوئی ادنیٰ مسلمان بلکہ کوئی عاقل ایک سکند کے لیے ان سے رضامند نہ ہو سکتا تھا۔ ابن عباس اور دیگر مشورہ دہندوں کے جواب میں خود امیر المومنین نے اپنا مطمح نظر واضح اور خوب صاف صاف بیان کر دیا ہے۔

علیؑ اور اولاد علیؑ کا نظریہ ہمیشہ یہی رہا اور یہی فرق علیؑ اور غیر علیؑ کی حکومت اور اس کے نظریہ میں ہے اور اس امر کو خوب اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ اہلبیت رسول کی نظر میں وہ حکومت (چاہے کتنی ہی بڑی اور مستحکم ہو) کوئی وقعت نہ رکھتی تھی۔ جس کی بنا استحصال بقا اور ترویج میں خلاف احکام الہیہ کوئی قانون، کوئی دفعہ یا کوئی عمل کیا جائے۔ مختصر یہ کہ اہم اور مقدم پابندی دین اور اسلام ہے بہ خلاف مخالفین کے کہ ان کا مقصد اصلی اقدام حکومت اور اس کا استحصال ہے اس مقصد کے لیے چاہے قوانین اسلامیہ کا انکار یا پس پشت ڈالنا یا خلاف اسلام امور کا ارتکاب (خواہ وقتی ہی طور پر ہو) اختیار کیا جائے اسی اصول کو ہر جگہ ملحوظ رکھنا چاہیے، جس کا خلاصہ یہ ہے ”مقدم دین“ ہے یا ”مقدم حکومت“ ہے۔ یہ تو جب ہے کہ جب مقدم کے بعد موثر بھی قابل توجہ ہو ورنہ غیر علیؑ کی حکومت میں تو اہمیت یا اقدیمیت کا سوال ہی نہ ہوتا تھا۔ مقصد حقیقی حکومت اور صرف اقتدار تھا۔ تو ارتح و احادیث میں اس کے شاہد

بکثرت ملتے ہیں۔ اب ایک صاحب انصاف کو یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ جو لوگ اسلام کے نمائندے، مسلمانوں کے حاکم، اسلامی شریعت کے محافظ، اسلامیات کے نگہبان ہونے کے مدعی ہوں ان کے لیے کیا زیبا ہے اسلامی اصول و فروع کی پابندی و ترویج یا نام اسلامی اور طریقے، قواعد، قوانین، عمل، اعمال وہی کچھ جس کو مٹانے کے لیے اسلام آیا اور جسے ساری عمر سرورِ کائناتِ قولاً و عملاً واضح کرتے رہے۔ امیر المومنینؑ نے لوگوں کے مشورے پر صاف صاف ماکنٹ متخذ المصلین عضدا فرما دیا۔ لوگ اسے سیاسی کمزوری کہیں نہیں اس سے ڈر نہیں معلوم ہوتا۔ کتاب و سنت اگر قابل اتباع و تمسک مانی جائے تو اس کے متبع کے لیے یہی زیبا تھا اور ہے کہ گمراہی کی ہمت افزائی ہرگز نہ کرے۔ وہ بھی کوئی اسلامی حکومت ہوئی جس کے اصول کی قرآن کے اساس میں بنائی جائے، جس کے احکام کا جنازہ اُس کے حکام کے ہاتھ نکالا جائے۔ امیر المومنینؑ کو صرف رسولؐ کے مشن سے مطلب تھا جو الیوم اکملت لکم سے مکمل ہو چکا تھا۔ اس میں کسی اصلاح و ترمیم کی گنجائش یا کوئی کمی باقی نہ نہ تھی نہ ہے۔ صرف نام بدل کر حکومت قیصر و کسریٰ اور دولت سکندر و دارا کی بنیاد ڈالنا مقصود نہ تھی۔ اگر علیؑ کی حکومت بھی خالص دینی نہ ہوتی تو دوسروں کی حکومتوں سے علیؑ کی حکومت کو کیا امتیاز ہوتا کسی کی حکومت میں پچاس قانون اسلام توڑے گئے ہوتے کسی کی حکومت میں دس، کسی میں پانچ قانون اسلام۔ بہر حال خود اپنی حکومت میں لاوارث ناشدنی اور ناقابل عمل رہتا تو دوسرے اس کی پرورش کیوں کرتے (وہاں دعویٰ اسلام

سیت اسلامی قانون کی مہمیت کا دعویٰ اگر جمع ہو سکتا ہو تو پھر کوئی زحمت نہیں، خلاصہ یہ کہ دین و دیانت داری کے خلاف ایک آن کے لیے بھی علیؑ کا راضی نہ ہونا تھا نہ ہوئے، اور اگر اسلام کا مطمح نظر اسلام کے نام کی حکومت قائم کرنا ہوتا تو اسی دن اس کا بہت اچھا موقع تھا جب عقبہ بن ربیعہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ "اے محمدؐ! تم جو مانگو میں دینے کو تیار ہوں" بشرطیکہ تم اپنے ادعا سے باز آؤ۔ اگر تم کوئی حسین عورت چاہتے ہو تو میں اس کا انتظام کر دوں، اور اگر دولت اور مال کی طمع ہو تو میں چندہ کر کے اتنا مال دوں کہ تم قوم میں سب سے زیادہ مالدار ہو جاؤ۔ اگر بادشاہت کی طمع ہو تو میں تمہیں قوم کا بادشاہ بھی بنا سکتا ہوں... الخ۔ لیکن سرور عالمؐ اپنے ادعا سے باز آتے یہ کیوں کر ممکن تھا، آپ کی زبان مبارک سے وحی الہی کے یہ الفاظ برآمد ہوئے:

فان اعرضوا فقل انذرکم صاعقة مثل صاعقة عاد و ثمود اور عقبہ دم بخود ہو کر رہ گیا۔

کیا رسولؐ کے لیے حکومت اسلامیہ قائم کرنے کا نہایت اچھا موقع ہاتھ نہ آگیا تھا۔ تھوڑی دیر کے لیے سکوت کر کے حکومت جمالیتے مگر حضرت نے اُسے بالکل ٹھکرا دیا اور اپنے ادعا سے باز نہ آئے اپنے دشمن میں لگے رہے جس نفع کے لیے مبعوث ہوئے تھے اس کی تلقین و ترویج کے سوا آپ کو کوئی چیز دلکش نظر نہ آئی۔ حکومت کی اہمیت پر جان دینے والوں کے نزدیک رسولؐ کا یہ فعل بھی معاذ اللہ غلط ہی معلوم ہونا چاہیے کیونکہ حکومت کی اہمیت اور اقدیمیت تو یہ چاہتی ہے کہ وقت اور موقع تھا اس وقت چُپ ہو جاتے اور لوگوں پر مال و دولت

تسلط و اقتدار جمالینے کے بعد پھر دھڑپے سے اسلام کی ترویج و اشاعت فرماتے۔ اس طرح وہ بیکس اور مظلوم شہدار بھی بچ جاتے جو ضعف کے سبب مارے گئے۔ حکومت کے بعد کس میں دم تھا کہ مثلاً عمار کے والدین کو اس بے دردی سے قتل کر سکتا۔ مگر سرور دو جہاں نے ایسی حکومت کی طرف ایک آن کے لیے رخ نہ فرمایا اور نہ ہی جنگ کی۔ ایک اور واقعہ اس طرح ہے جس میں اور تصریح ہے:

”کفار قریش نے مکرًا جناب ابوطالب علیہ السلام کے پاس آکر وہی درخواست کی جو پہلے کی تھی۔ اور یہ بھی کہا کہ اگر آپ اپنے بھتیجے کو نہ روکیں گے تو پھر ہم سے آپ سے ایسی شدید جنگ ہوگی کہ بالآخر ایک فریق فنا ہو جائے گا۔ یہ ابوطالب پر بہت گراں گذرا اور انہوں نے آنحضرت سے کہا کہ اسے بھتیجے! لوگ ایسا ایسا کہتے ہیں، اس پر آنحضرت کو خیال ہوا کہ (شاید) ابوطالب میری رفاقت سے دست بردار ہونا چاہتے ہیں۔ کہنے لگے کہ چچا! اگر یہ لوگ میرے داہنے ہاتھ پر آفتاب اور بائیں پر ماہتاب بھی رکھ دیں تب بھی میں اس امر حق سے باز نہیں آنے والا۔“

(ابوالفداء، ج ۱ ص ۱۱۷، طبع حیدرآباد)

اس سے واضح ہو گیا کہ حضرت کو کیا چیز اہم اور عزیز تھی۔ آپ کو زمین اور آسمان کی حکومت مقدم نہ معلوم ہوتی تھی (دور نہ اس وقت چُپ ہو جاتے اور حکومت جمالینے پھر بقول شخصے اسلام کی تبلیغ کرتے رہتے۔ جب یہ واضح ہے تو علی بن ابی طالب جن کو اپنے تمام اعمال و افعال میں رسول اور صرف رسول کی پیروی محبوب و مطلوب تھی، حکومت دنیا اور اس کے گمراہوں کی ہمت افزائی یا ہمدردی یا اس

پرسکوت کیونکر فرما سکتے تھے۔ یاد کرو اس وقت کو جب جنگ احد میں لوگ رسول کو تنہا چھوڑ کر بھاگ گئے اور اس وقت شدت غضب سے آنحضرت کی پیشانی مبارک سے پسینہ ٹپک رہا تھا۔ آپ نے حضرت علیؑ کو دیکھا جو آپ کے پہلے مبارک پر کھڑے ہوئے تھے۔ آنحضرت نے فرمایا کہ تم اپنے بھائیوں کے ساتھ کیوں نہ بھاگ گئے۔ حضرت علیؑ نے عرض کی اؤ اَکْفَرُ بَعْدَ الْاِیْمَانِ اِنَّ لِي بِلِكِ اسْوَةِ (کیا میں ایمان لا کر کافر ہو جاتا، مجھے تو آپ کی تاسی کرنا ہے) دیکھو مدارج النبوة، جلد ۲، ص ۱۶۱، نو لکشر پریس ۱۹۱۳ء۔ اب کسی کو اشتباہ نہیں رہ سکتا کہ اہلبیت کے نزدیک صرف ایک بات قابل توجہ، قابل عمل اور اہمیت کی تھی، یعنی تاسی رسولؐ۔ لہذا ان کے اعمال کو دنیاوی معیار پر جانچنا یا انھیں ان دنیاوی چالوں کی رلے دینا جو دنیا داران محض کا مقصود ہوتی ہے یا ان عیاروں پر عمل نہ کرنے میں قابل اعتراض سمجھنا انصاف کا خون کا خون کرنا ہے۔

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ اصلی اور دینی وجہ تو وہی تھی جو امیر المؤمنینؑ نے ارشاد فرمایا۔ لیکن اگر سیاست دنیا کا بھی لحاظ کر کے دیکھا جائے تب بھی جو کچھ علیؑ نے کیا اسی کو عین مصلحت سمجھنا چاہیے اس لیے کہ وہ حکام وہی تو تھے جن سے عام مسلمانوں کو حد درجہ نفرت تھی جن کے کرتوت سے مسلمانوں کے ناک میں دم آگیا تھا، شکایتوں پر شکایتیں کی گئیں۔ مگر جب دربار خلافت میں کوئی خنوائی نہ ہوئی تو بلوہ کی نوبت آئی اور ان اعمال کے حاکم اعلیٰ حضرت عثمان کو قتل کر دیا گیا۔ کیا اسی ولید کو حاکم باقی رکھنا عقلاً درست کہا جائے گا جس کی نالائقی نے مصریوں کو بلوائی بنا دیا۔ کیا اسی مروان کا اقتدار باقی رہنے دینا صحیح سمجھا جاسکتا ہے جس کے تسلط نے

حضرت عثمان کی جان لی وغیرہ۔ اس کے علاوہ اُن حکام میں بعض تو ایسے تھے جن پر اپنی زندگی میں خود دو جہان کے سردار صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تصریح مردود و ملعون و کافر ہونے کا حکم لگا گئے تھے۔ ولید کا واقعہ یاد کرو۔ مصر کے عامل کا قضیہ دیکھو، ابن ابی سرح کے حال پر نظر کرو۔ اس بنا پر زمانہ عثمان کے گورنروں کو معزول کرنا سیاست ظاہری کے اعتبار سے بھی یہ فوائد رکھتا تھا کہ وہ کل بلوائی جو حضرت عثمان کی حکومت اور ان کے عمال کی ولایت سے تنگ تھے چُپ ہو جائیں۔ وہ کل اصحاب خاص جو باقاعدہ پابند اسلام تھے وہ حضرت عثمان کے اس طرز عمل سے جو ان اصحاب کے ساتھ روار کھا گیا تھا ناراض تھے۔ فی الجملہ آنکھیں ٹھنڈی کریں۔ اور ذرا گہری نظر کیجئے جب وہ عمال اس درجہ بے وفا اور نمک حرام تھے کہ حضرت عثمان قتل کر دیئے گئے اور ان لوگوں کے پاس فوج، خزانہ سب کچھ تھا پھر بھی کسی نے اپنے محسن کی مدد نہ کی۔ تو حضرت علیؑ کو ایسے بے وفا اور نمک حرام لوگوں سے کیا امید ہو سکتی تھی۔ یہ وہ لوگ تھے کہ حسب شہادت تو ارتخ و سیر خلافت حکم خدا اور رسولؐ گلچھڑے اُڑانے کے عادی اور مشاق ہو چکے تھے ان کو اسی طرح چھوڑا جاتا تو ان کے طعنیان اور سرکشی میں اضافہ ہوتا اور اگر ٹوکا جاتا تو ظاہر ہے ان لوگوں کو کڑوا معلوم ہوتا اور سرکشی و فساد برپا کر دیتے۔ ان میں سے اکثر بلکہ تمام تر وہی لوگ تھے جو کھلم کھلا بنی ہاشم اور خصوصاً علی بن ابی طالب کے

---

لحاظ دار ہے کہ حضرت عثمان ۴۰ اور ۴۹ دن کے درمیان محاصرہ میں رہے۔ اگر بیٹو اور خود غرضی عمال مدد کرنا چاہتے تو بہت دور دور سے آکر مدد کر سکتے تھے۔

دشمن تھے (اگر پابند شریعت ہوتے تو نہ علیؑ کے دشمن ہوتے نہ علیؑ کو ان سے عداوت ہوتی) جس کا ثبوت معزولی کے حکم سے اور اس سے پہلے ان لوگوں کے کردار و گفتار سے ملتا رہا۔ ایسے لوگوں پر آئندہ حکومت میں کیا اعتماد کیا جاسکتا تھا، یہ لوگ بھلا کا ہے کو علیؑ کی سُننے والے تھے علیؑ پر دینا ہی صحیح تھا ورنہ ساتھ رہ کر رعایا کو بگاڑ کر وقت پر دھوکا دے کر نہایت مُضر ثابت ہوتے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ثابت کرنے کے لیے کہ سب لوگ جان لیں کہ ان لوگوں کو (جن کو حکم معزولی دیا جا رہا ہے) اسلام یا مصالح دینیہ پیش نظر رکھ کر واجب الاطاعتہ خلیفہ کے (جو تمہارے خیالات کے مطابق جیسا بھی اجماع ہو اس کے ذریعہ خلیفہ مانا جا چکا ہے) احکام کی پیروی اور احترام عزیز نہیں ہے بلکہ ان کا مقصود دنیا اور صرف حکومت ہے کیونکہ اگر ایسا نہ تھا تو اطاعت کا مقتضی یہی ہے کہ جیسا حکم ملے ویسا کرو۔ گویا بعقیدہ اہل سنت جو خلفاء راشدین کی اطاعت کو لازم قرار دیتے ہیں ان کے سامنے ایسے منکرین اور متفقین کے ایمان اور اسلام کی حقیقت بھی کھولنا تھی گویا ایسے لوگ براتفاق شیعہ و سنی خارج از اسلام و ایمان ہو جاتے ہیں۔ ممکن ہے کہ منظر العجائب کے ان احکام میں اور بھی اسباب و مصالح ہوں۔

خلاصہ یہ کہ حضرت علیؑ کو روش دنیا بھی معلوم تھی۔ چنانچہ آپ نے فرمایا دیا کہ مصلحت دنیوی تو وہی ہے جو تم کہتے ہو۔ مگر میری نظر عقلی مصلحت دین ہے۔ آپ نے اکثر فرمایا ہے ”لولا الدین والتقی لکننت ادھی“ (اگر دین کی پابندی اور خدا کا خوف نہ ہوتا تو میں دیکھتا کہ مجھ سے زیادہ چالاک کون ہے؟) بہر حال آپ نے برابر سچی کی کہ دین مبین پھیلے مگر دنیا کو مقدم رکھنے والوں نے دنیا نہیں

بلکہ فتنہ پھیلایا۔ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خبر دے ہی گئے تھے کہ علیؑ! تمہیں  
 ناکشین، قاسطین اور مارقین سے مقابلہ و مقاتلہ کرنا پڑے گا بھلا الحق مرکون  
 علی مع الحق والحق مع علی کے احکام دین داری کو سنتا تھا آپ کے خلاف  
 اعلان جنگ ہو ہی گیا۔ قبل اس کے کہ علیؑ سرکش گورزوں کی سرکوبی کریں جنگِ جمل  
 آن پڑی۔ حضرت عائشہ کی کمان داری میں جناب طلحہ و زبیر کی جماعت نے جنگِ جمل  
 کا رنگ جما دیا جنگ کی ابتدا اس کے واقعات اور اس کا اختتام بیان کرنے کا  
 موقع نہیں ہے، اسلامی تواریخ دیکھئے۔ اتنی بات اس جگہ پر یاد دلادینے کی ہے  
 کہ حضرت عائشہ رسولِ خدا کی بیوی اور حضرت ابو بکر کی بیٹی تھیں، طلحہ و زبیر اہلسنت  
 کے نزدیک عشرہ مبشرہ میں داخل ہیں۔ طلحہ حضرت ابو بکر کے چچا کے بیٹے اور داماد  
 تھے۔ ام کلثوم بنت ابی بکر جو حضرت ابو بکر کی وفات کے بعد پیدا ہوئیں طلحہ سے  
 نکاح ہوا تھا۔ ان کی ماں ابوسفیان کی بیٹی معاویہ کی بہن تھیں۔ زبیر رسول کی پھوپھی  
 صفیہ بنت عبدالمطلب کے بیٹے تھے یہ بھی حضرت ابو بکر کے داماد تھے، دیکھو تاریخ اسلام  
 مختصر یہ کہ جنگِ جمل ہوئی اور بقول ابوالفداء طرفین سے دس ہزار جانوں کا نقصان  
 ہوا۔ بعض مورخین نے نقصان کی تعداد بیس ہزار تک لکھی ہے۔ بعضوں نے اکیس  
 بائیس ہزار تک بیان کیا ہے۔ اس جنگ میں علیؑ نے جو شجاعت، شرافت و انصاف  
 کا مظاہرہ کیا ہے وہ تاقیامت تاریخوں کے اوراق پر سنہرے حرفوں میں پڑھے  
 جائیں گے۔ صاحب استیعاب نے رفاعہ بن رافع کے حالات کے سلسلہ میں نقل  
 کیا ہے کہ علیؑ نے فرمایا ہے کہ واللہ ان طلحة والزبیر وعائشة ليعلمون  
 لہ لطفہ اور خوش عقیدتی دیکھئے کہ باوجود اس کے حضرت علیؑ کے مخالفین کا زمانہ چھوڑا گیا ان کو  
 (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

انی علی الحق وانهم مبطون (بجدا کہ طلحہ وزیر دعائے خوب اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں حق پر ہوں اور وہ لوگ باطل پر) نتیجہ میں علیؑ کو کامیابی ہوئی برحق اور فاتح علیؑ نے شکست خوردہ اور ناحق مقتولین اور اسیران جنگ کے ساتھ جس شرافت کا برتاؤ کیا اس کا مقتضی تو غیرت دار ہی سمجھ سکتا ہے۔ لیکن مفتوحین اور ان کے ورثہ اور ہمدردوں کے کیا رنگ رہے صاحبان واقفیت اس سے اچھی طرح واقف ہیں۔ جمل کے ختم ہوتے ہی حاکم شام سے مقابلہ کی ٹھہری۔ رسولؐ کی پیشینگوئی کا ایک جزرہ ناکشیں سے جنگ کا تمام ہوا۔ اب قاسطین کی باری آئی۔ اوپر معلوم ہو چکا ہے اب تو براہ راست آپؐ خود بھی گورنر مقرر فرماتے ہیں۔ چنانچہ جناب کی طرف سے حمص میں عبدالرحمن بن خالد قنسرین میں، جبیب بن مسلمہ فہری اردن میں، ابوالاعور سلمی فلسطین میں، علقمہ بن حکیم کنانی، بحری علاء (سواحل) پر عبداللہ بن قیس فراری۔ اب ظاہر ہے کہ ان صوبوں میں اتنی کافی مدت تک موقع پا کر کیا اقتدار اور تسلط حاصل کر لیا ہوگا اور اہلبیتؑ کے خلاف کیا کچھ سامان ہتھیانہ ہو چکا ہوگا۔ اہلبیت طاہرین کے لیے تو رسولؐ کی آنکھ بند ہوتے ہی دنیا اندھیر ہو چکی تھی۔ دوسرے ہی صوبوں میں ان کو کشا یاد کیا جاتا تھا کہ معاویہ کے حدود حکومت میں ان کا کوئی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

بُرا سمجھا گیا، نہ ان کو ناحق کہا جاتا۔ اگر خلافت اولیٰ، ثانیہ، ثالثہ میں علیؑ نے جنگ کی ہوتی تو ان عقیدت مندوں میں سے کتنے علیؑ کی خلافت مانتے اور مخالف کو باطل پر سمجھتے۔ اب یہ کہنا کہ لنازع کمانازع معاویہ کی بانگ کو کیا کہا جائے۔

ذکر خیر کر سکتا۔ ان حدود میں تو یہ عالم کر دیا گیا تھا کہ لوگ مساویہ اور بنی امیہ سے زیادہ کسی کو رسول کا قریبی رشتہ دار جانتے ہی نہ تھے۔ خود شام میں رسول کے قریب لیا جگر پاروں کے متعلق یہ رنگ تھا کہ جسے سعودی نے نقل کیا ہے :

”ہمارے بعض اہل علم بھائیوں نے بیان کیا کہ ہم لوگ ابو بکر و عمر و علی و مساویہ کے متعلق بیٹھ کر باتیں کیا کرتے تھے اور اہل علم کے اقوال بیان کیا کرتے تھے۔ عام لوگ بھی آیا جایا کرتے تھے اور ہماری باتیں سنا کرتے تھے۔ آخر ایک دن ان میں سے ایک کہنے لگا جو ان سب میں زیادہ عقل مند بھی تھا اور اس کی دائرہ بھی بڑی تھی (غالباً سن رسیدہ ہو گا) کہ بھلا تم لوگ علی و مساویہ اور فلاں فلاں کا ذکر کب تک کرتے رہو گے۔ اس پر میں نے پوچھا کہ اس معاملہ میں تمہاری کیا رائے ہے؟ کہا کہ علی کے متعلق کیا کہتے ہو؟ اُس نے کہا وہی علیؑ ناجو فاطمہ کے باپ تھے۔ تب میں نے یہ بھی پوچھا کہ اچھا فاطمہ کون؟ اس نے کہا کہ نبیؐ کی بیوی عائشہ کی بیٹی مساویہ کی بہن۔ اب میں نے کہا کہ اچھا علیؑ کے متعلق واقعہ کیا ہے اُس نے کہا کہ وہ جنگ حنین میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ شہید ہو گئے۔“

(مروج الذهب بر حاشیہ نفع الطیب جلد ۲ ص ۲۷۷ طبع انڈیا بریسر)

اس طرح اہلبیت سے دنیا کو غافل بنا دیا جا چکا تھا، اور پھر طریق حکومت کا تو کہنا ہی کیا ہے۔ ایک واقعہ تفریح خاطر کے لیے پیش ہے جس سے واضح ہو گا کہ یہ حکومت جسے عقیدت مند مسلمان اسلامی ہی کہتے جاتے ہیں اور فیصلہ

جسے دینی ہی سمجھے جاتے ہیں صرف اپنے آدمیوں کی خاطر دارمی اور علیؑ کے (فرضی) ماننے والے کے لیے (چونکہ یہ شخص کو مذکات تھا) اسلام اور احکام قرآن من لہم یحکمہ بما انزل اللہ کی کیسی پابند تھی اور اس کو حق کا پاس کتنا تھا۔

”ایک کو فی اپنے اونٹ پر سوار دمشق میں آگیا۔ سب لوگ صفین سے واپس ہو رہے تھے۔ چنانچہ ایک دمشق لٹک گیا اور کہنے لگا کہ یہ اونٹنی تو میری ہے مجھ سے صفین میں چھینی گئی ہے۔ یہ مقدمہ معاویہ کے پاس پہنچا اور گواہی کے لیے دمشق نے (اکٹھے) پچاس آدمی لاکھڑے کیے جنہوں نے گواہی دی کہ بے شک یہ اونٹنی اسی دمشق کی ہے۔ چنانچہ معاویہ نے کو فی کے خلاف (دمشق کے حق میں) فیصلہ کر دیا۔ اب کو فی بولا کہ خدا تمہیں سنوارے (انکھیں نہیں تو ٹپوں کے دیکھو) یہ اونٹ (نر) ہے اونٹنی (مادہ) نہیں ہے (جس کی سب گواہی دے رہے ہو) یہ سن کر معاویہ نے کہا یہ حکم تو اب نافذ ہو چکا۔ (واقعہ چاہے کچھ ہوا بات وہی رہے گی جو ہم نے کہہ دی۔)

(مروج الذهب بر حاشیہ فتح الطیب ج ۲ ص ۲۵ مطبوعہ ازہر بیروت ۱۳۰۴ھ)

اسلام کی راستی اور راستبازی کی تعلیم ایک طرف اور اسلامی حکومت کے اعمال اور ان کی کارستانیوں اس طرح کی دوسری طرف اور عوام ان اس کارنگ یہ کہ باوجود مسلمان ہونے کے ان امور کی طرف توجہ تک نہ دارو ان کو روکنا ٹوکنایا ان کے خلاف مرضی خدا و رسول ہونے کا اعلان کس کو ضرورت یا کس کی طاقت تھی۔ دین خدا ایک بازیچہ اطفال تھا۔ عبادات، معاملات سب میں اپنا استقلال و استبداد نسخ و ترمیم

جاری نوبت بایںجا رسید کہ جمعہ کی نماز دن دباڑے بدھ کو ادا کر دی جاتی ہے۔ جہاں اس قسم کی اندھا دھند چلی ہوئی ہو۔ صراطِ مستقیم اور حجِ بیضا پر چلانے والے ہادی ہمدی علی بن ابی طالبؑ کی کیا چل سکتی تھی۔ رسولِ خداؐ خود بھی علیؑ کی اس صفت کا اعلان فرما چکے تھے اور جناب عمرؓ نے بھی اس صفت کو مانا ہے۔

## علیؑ راہِ حق ہی پر چلانے والے ہیں

”حضرت علیؑ سے مروی ہے کہ آپ نے رسول اللہؐ سے دریافت کیا کہ آپ کے بعد کون امیر بنایا جائے گا؟ آپ نے فرمایا کہ اگر ابو بکر کو حاکم بناؤ گے تو انھیں امین اور دنیا میں زہاد اور عاقبت کا خواہاں پاؤ گے اور اگر عمر کو خلیفہ بنایا تو انھیں قوی اور امین پاؤ گے جو اللہ کے کاموں میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ نہ کریں گے۔ اور اگر تم لوگ علیؑ کو حاکم بناؤ گے، مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ تم ایسا نہیں کرنے والے ہو۔ بہر حال ان کو تم خود ہدایت یافتہ اور دوسروں کی ہدایت کرنے والا پاؤ گے اور وہ تمہیں صراطِ مستقیم ہی کی طرف کھینچیں گے۔“

(یہ روایت مشکوٰۃ باب مناقب عشرہ میں بھی موجود ہے)

ایسی روایتوں سے شیعوں پر تو کوئی حجت نہیں البتہ اہل سنت پر لزوم ہے کہ سرورِ عالم جانتے تھے کہ یہ لوگ علیؑ کو خلیفہ بنانے والے نہیں اور اگر بنائیں تو ہدایت یافتہ ہدایت کنندہ پائیں گے۔ یہی صفت حضرت عمرؓ نے بھی علیؑ کے لیے تسلیم کی ہے جب بقول اہلسنت حضرت عمرؓ سے خلیفہ نامزد کرنے کی درخواست کی گئی تو کہا:

”اے علی! قسم خدا کی پس تم (خلافت کے اہل ہو) مگر (عیب) یہ ہے کہ تم خوش مزاج ہو۔ خدا کی قسم اگر تم والی ہو گے تو تم سب کو حق واضح پر ہی چلانا چاہو گے اور شاہ راہ مستقیم و نورانی پر ہی لوگوں کو چلاؤ گے۔“

(ابن ابی الحدید ج ۱، ص ۶۲ ذیل خطبہ شمشقہ طبع مصر)

اب ظاہر ہے کہ چاہے جو کچھ بھی ہو یا ہوتا علیؑ کو یہی (پابندی حق) کرنا تھی اور یہی کیا ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک هم الکافرون اور دنیا داروں، ہوا پرستوں سے جو اُمید ہو سکتی ہے اس طرف سے وہی ظاہر ہوا، کھلم کھلا علیؑ پر سب شتم کی گئی۔ بقول ابن خلدون وغیرہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ علیؑ بن ابی طالب، ابن عباس، حسن و حسین اور مالک اشتر (علیہم السلام) پر معاویہ نے لعنت کرنا اپنا شیوہ قرار دے لیا۔ (ترجمہ ابن خلدون جلد ۱ ص ۳۸۰) برسہا برس نماز جمعہ اور خطبوں میں نماز کے اندر تنوتوں میں ایسے کفر کے کلمات کہے گئے۔ لیکن سازش کام کر چکی تھی۔ اب کون تھا جو اس امر شیعہ کو بُری نگاہ سے دیکھتا۔ بانی اسلام کو آنکھ بند کیے ہوئے ابھی تیس سال بھی نہیں گذرے کہ کھلم کھلا اُن کی تعلیم، اُن کا خاندان، اُن کی عزت، اُن کے اہلیت سب کی پوری طرح تزییل ان لوگوں کے حکم اور حکومت میں ہونے لگی جو اپنے آپ کو دنیا کے سامنے بانی اسلام کا پیرو، عزیز اور سچا جانشین ظاہر کر رہے تھے۔ حکومت اسلام میں ایسے مسلمان حاکم در عیاض سے رسولؐ کے قدم بہ قدم پیرو بلکہ نفس رسولؐ کو نصرت و حمایت کی کیا توقع

لے پھر بھی مدعیان اسلام ان لوگوں کو سچا اور قابلِ اطاعت مان رہے ہیں۔

ہو سکتی تھی۔ علیؑ کی مخالفت کا وہ بیج جو حاسد منافقوں کے دل میں رسولؐ کی زندگی سے جم چکا تھا آہستہ آہستہ نشوونما پا رہا تھا، سقیفہ کی کارروائی نے اس پر خوب آبیاری کی۔ عداوت اہل بیت کا شجرہ ملعونہ فی القرآن اب کافی مستحکم ہو چکا اگرچہ اس درخت کے پھل وقت بے وقت پہلے بھی دکھائی دیتے رہے، لیکن صفین کے میدان میں اپنی پوری مراد پر سر بازار آگئے، ایک دو کا ذکر کیا ستر لڑائیاں لڑی گئیں۔ ایک طرف ابن آکلاہ الاکباد اور دوسری جانب بنت اسد و ابوطالب کا فرزند شیر خدا۔ آخری لیلۃ الہریر میں وہ رن پڑا کہ کشتوں کے پتے لگ گئے جناب مالک اشتر رومی و ارواح المؤمنین لہ الفداء نے وہ کار نمایاں کیا جو قیامت تک یادگار ہے اس حملہ کی تاب معاویہ کی فوج کسی طرح نہ لاسکی بھاگنے کی ٹھانی۔ معاویہ کو بڑی گھبراہٹ ہوئی، عمرو عاص سے جو بقول شبلی صاحب کے سیاست و تدبیر کا قابل جسمہ تھا کہا کہ کوئی تدبیر کرو نہیں تو اگر تھوڑی دیر ایسی ہی لڑائی رہی تو کہیں ہمارا نشان نہ ملے گا۔ عمرو عاص سے اور تو کچھ بن نہ پڑا یہ چال چلا کہ جتنے قرآن لڑنے والوں کے خیوں میں دستیاب ہوئے (بہ روایت سعودی پانچ سو کی تعداد تھی) نیزوں پر باندھ کر ٹکوا دیے اور بہ آواز بلند کہلانا شروع کر دیا "یہ کلام اللہ ہے تمہارے درمیان ہے" مدعا یہ تھا کہ اس طرح لڑائی میں وقفہ اور لڑنے والوں میں اختلاف پڑ جائے۔ اب کیا تھا جادو چل گیا۔ اشعث بن قیس نے جسے بہ روایت جیب السیر و روضۃ الصفا معاویہ نے بھاری رقم رشوت میں بھیج دی تھی اور اکثر قبیلے

لہ اس کا رشتہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔

اس کے تابع تھے اور بعض دیگر سرداران سپاہ نے جو معاویہ سے (علحدہ علیحدہ بھی) رقیوں رشوت میں لے چکے تھے تیر اندازی بند کر دی۔ امیر المومنین کی فوج میں کس قسم کے لوگ جمع تھے اس کی تصریح خود بہ زبان معاویہ سنئے :

”معاویہ کا بیان ہے کہ میں نے علیؑ کے خلاف تین باتوں سے کام لیا (۱) وہ ایسے آدمی تھے کہ اکثر اپنا راز ظاہر کر دیتے تھے اور میں اپنا راز چھپائے رہتا تھا (۲) ان کو ایسی فوج ملی تھی جو حد درجہ خبیث تھی اور ان کی نہایت سخت مخالفت تھی اور میں نے وہ فوج پائی تھی جو نہایت درجہ مطیع تھی اور میرے مخالف بالکل نہ تھی (۳) جب علیؑ نے اصحاب جبل پر فتح پائی اس وقت مجھے اس باب میں ذرا شک نہ تھا کہ (علیؑ) دوں سے ایک مصیبت میں ضرور مبتلا ہو گئے یا تو اس کو ان کی فوج کے لوگ ان کی دینی کمزوری خیال کریں گے (یا) اگر جبل والوں کو فتح ہو جاتی پھر علیؑ کی شوکت (فوجی اقتدار) کمزور پڑ جاتی۔ یہ باتیں تو تھیں ہی ان کے علاوہ قریش مجھے علیؑ سے زیادہ اس لیے دوست رکھتے تھے کہ میں انھیں مال دیتا تھا اور وہ نہ دیتے تھے تو اب ان سے نفرت و علیحدگی کے کتنے سبب ہو گئے۔“

(استیعاب جلد ۱ ص ۲۶۴، حیدرآباد حروف مہم حالات معاویہ)

جن لوگوں کو امیر المومنین کے انصار اور فوج کی تعداد دیکھ کر شبہ ہوتا ہے وہ ہشیار ہو کر ان باتوں کو پڑھیں۔ اشعث اور انیس قبیل لوگوں کے متعلق یہ خیال کرنا کہ امیر المومنین کے طرف دار تھے بڑی بھاری غلطی اور تاریخی حقیقت سے چشم پوشی ہے۔ آپ کی فوج میں بھی منافقین کی کثرت تھی جیسا کہ سرور عالم کی فوج میں اکثر ہوا کرتی

تھی اور منکم من یرید الدنیا ومنکم من یرید الآخرة تو قرآن مجید میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب کے لیے بتصریح ہی مذکور ہے۔ بہر حال نیزوں پر قرآن کا بلند ہونا تھا کہ رنگ ہی دوسرا ہو گیا۔ امیر المؤمنین اور آپ کے لشکریوں میں جن میں سے اکثروں نے معادیہ سے رشوت لے لی تھی (روضۃ الاحباب حبیب السیر) جو گفتگو ہوئی وہ اس درجہ دردناک اور تاسف انگیز ہے جس پر ہر صاحب عقل کف افسوس ملتا ہے۔ امیر المؤمنین نے ہر چند سمجھایا مگر معادیہ کا دیا ہوا فقرہ تران لوگوں کو عاقبت کی فکر کی طرف کب متوجہ ہونے دیتا تھا۔ ترجمہ ابن خلدون جلد چہارم ص ۲۶۴ مطبوعہ الہ آباد میں اس طرح مرقوم ہے:

”مصاحف نیزوں پر اٹھائے گئے لوگوں نے کہنا شروع کر دیا ہم کتاب اللہ کے فیصلہ کو منظور کرتے ہیں۔ امیر المؤمنین علیؑ نے لٹکارا، اسے اللہ کے بندو! اپنے حق کے حاصل کرنے کو بڑھو اور دشمنوں سے جنگ کرنے میں تامل نہ کرو کیوں کہ معادیہ، ابن ابی معیط، حبیب، ابن ابی سرح، ضحاک، صاحب دین و قرآن ہیں نہ صاحب ایمان ہیں، ہم ان کی حالت سے بخوبی واقف ہیں ہم ان کے لڑکپن اور بڑے ہونے کے بعد بھی محبت میں رہے ہیں۔ لڑکپن میں وہ نہایت شریر لڑکوں میں سے تھا اور سن شعور پر پہنچ کر بھی بے حد شریر آدمیوں سے ہوا۔ افسوس تم لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ان لوگوں نے قرآن شریف کو براہِ مکرو فریب اٹھایا ہے، لوگوں نے

لے تم سے وہ بھی ہیں جو دنیا کے دل دادہ اور وہ بھی جو آخرت کے خواہاں ہیں۔

کہا ہم سے یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم کتاب اللہ کی طرف بلائے جائیں اور اس کو منظور نہ کریں۔ امیر المؤمنین علیؑ نے ارشاد کیا ہم ان لوگوں سے اسی لیے لڑتے ہیں کہ کتاب اللہ پر عمل کریں کیونکہ انھوں نے اُس کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ مسعر بن مذکشمی اور زید بن حصین الطائیؓ مع ان لوگوں کے جو بعد کو خوارج ہو گئے تھے بولے، اے علیؑ! کتاب خدا کو قبول و منظور کرو ورنہ ہم تم کو چھوڑ دیں گے اور تمہارے ساتھ وہی برتاؤ کریں گے جو ابن عفان کے ساتھ کیا تھا۔ امیر المؤمنینؑ نے فرمایا، اگر تم میرے مطیع ہو تو برابر لڑتے رہو اور اگر باغی ہو اچاہتے ہو تو جو تمہاری سمجھ میں آئے وہ کرو۔“

ابن خلدون کے علاوہ روضۃ الصفا، حبیب السیر، تاریخ ابن واضح وغیرہ نے بھی بجز بعض لفظی اختلاف کے باتفاق یہی لکھا ہے۔ اس موقع پر ابوالفدا راجح (ص ۷۷) کی عبارت کثیر الفوائد ہونے کے سبب قابل غور و ملاحظہ ہے:

”مسعود تمیمی اور زید بن حصین الطائیؓ نے اس جماعت سمیت جو بعد

میں خوارج ہو گئے علیؑ سے کہا کہ دعوت دی جا رہی ہے تو تم کتاب خدا کو مان لو ورنہ ہم تم کو مکمل دشمن کے حوالہ کر دیں گے اور تمہارے ساتھ وہی سلوک کریں گے جو ابن عفان کے ساتھ کیا ہے۔ اس پر علیؑ نے کہا کہ اگر تم ہماری مانند ہو تو لڑے جاؤ، اور اگر نہیں مانتے تو پھر جو چاہو کرو جو سمجھ میں آئے بناؤ۔ ان لوگوں نے کہا کہ اشرک کے پاس کسی کو بھیجے کہ وہ لوٹ آئیں اس پر حضرت علیؑ نے ان کو بلانے کے لیے کسی کو بھیجا۔ (وہ پہنچا اشرک کو کہاں یقین آنے والا تھا کہ علیؑ نے ایسے موقع پر روکا ہوگا) اس پر

اشتر نے کہا یہ موقع نہیں کہ تم جگہ سے مجھے ہٹاؤ۔ یہ سن کر ایلچی واپس آیا اور علیؑ سے واقعہ بیان کر دیا، اس پر شور و غوغا ہو گیا۔ اُدھر اشتر کی طرف سے غبار بلند ہوا۔ ان لوگوں نے کہنا شروع کر دیا کہ ہماری سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ آپ نے لڑنے ہی کا حکم دیا ہے۔ اس پر حضرت علیؑ نے فرمایا کہ تمہارے سامنے ہی تو بھیجا ہے بھلا تم نے مجھے دیکھا کہ اشتر کے پاس کچھ چُپکے سے کہہ کے بھیجا ہے جو کچھ میں نے کہا کیا وہ سب تم سن نہیں رہے تھے (کوئی کاہنہ کو علیؑ کی کچھ سُنتا کسی بات کے جواب بغیر پھر سب نے کہا کہ اشتر کے پاس بھیجے کہ واپس آجاؤں ورنہ ہم آپ کو معزول کر دیں گے۔ اب ایلچی پھر اشتر کے پاس آیا اور ان سے ساری حقیقت بیان کر دی۔ تب اشتر نے کہا کہ میں جان گیا قسم خدا کی قرآن کا اٹھانا اختلاف پیدا کر دے گا۔ یقیناً یہ مشورہ فرزند زانیہ کلہے (مختصر یہ کہ، اب اشتر علیؑ کے پاس واپس آگئے۔) جو لوگ وہاں جمع تھے کس نے کیا کہا تھا اس کی خبر تو مالک کو تھی نہیں سب کو اپنا ہی سمجھ لے تھے، آتے ہی کہنے لگے کہ تم لوگوں کو دھوکا دیا گیا اور تم لوگوں نے دھوکا کھایا حالانکہ (مالک کو کیا پتہ کہ) یہاں پر جو لوگ جمع تھے ان میں اکثریت انھیں لوگوں کی تھی جنھوں نے خود ہی لڑائی سے روکا تھا۔ اور جب لڑائی رُک گئی تو معاویہ سے انھیں لوگوں نے پوچھا کہ قرآن کیوں بلند کیا ہے اس نے کہا کہ اس لیے کہ ایک حکم تم لوگ معین کرو ایک ہم مقرر کرتے ہیں اور ان سے عہد لیا جائے کہ وہ کتابِ خدا پر عمل

کریں۔ (اُسی کے مطابق فیصلہ کریں) پھر ہم لوگ ان کے متفقہ  
 فیصلہ کی پیروی کریں۔ فریقین نے اُسے تسلیم کر لیا (بنے ہوئے تو تھے  
 ہی کیوں نہ تسلیم کرتے اور اتنا ہی نہیں ہوا بلکہ فوراً ہی) اشعث بن قیس  
 جو خوارج کا سردار تھا بول اٹھا کہ ہم تو ابو موسیٰ اشعری کے حکم ہونے پر  
 راضی ہیں۔ اس پر علیؑ نے کہا کہ دیکھو پہلی بات میں تم لوگ میری مخالفت  
 کر چکے اب بھی میری مخالفت نہ کرو، میری رائے نہیں ہے کہ ابو موسیٰ  
 کو حکم بناؤں۔ لوگوں نے کہنا شروع کیا کہ ہم ابو موسیٰ کے سوا کسی پر  
 راضی نہیں۔ اس پر علیؑ نے واضح طور سے کہا کہ ابو موسیٰ قابل اعتبار  
 آدمی نہیں ہے۔ ابن عباس ابو موسیٰ سے بہتر ہیں اس پر لوگوں نے  
 کہا کہ وہ تو آپ کے چچا زاد بھائی ہیں اور ہم ایسا آدمی چاہتے ہیں جو  
 تمہارے اور معاویہ کے لیے برابر ہو۔ اب علیؑ نے کہا تو پھر اشتر  
 ان لوگوں نے اس کا بھی انکار کیا اور یہ کہا کہ وہی تو اس جنگ کے  
 بھڑکانے والے ہیں۔ اب علیؑ بالکل مجبور ہو گئے کہ ان لوگوں ہی کی  
 بات مانیں چنانچہ اس مطلب کے لیے ابو موسیٰ کو فوج سے الگ کیا  
 اور معاویہ نے عمرو عاص بن وائل کو الگ کیا اور حکین علیؑ کے پاس  
 آکر ان کے سامنے اس طرح صلح نامہ لکھنے لگے۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم  
 یہ وہ صلح نامہ ہے جو امیر المومنین علیؑ نے لکھوایا ہے وہ بول اٹھا کہ  
 علیؑ تمہارے امیر ہوں گے، ہمارے امیر تو ہیں نہیں۔ اس پر احنف  
 نے کہا امیر المومنین کا نام تو ہم نہیں مٹائیں گے۔ اس پر اشعث بن

قیس بولا کہ یہ نام مٹا دو۔ آخر علیؑ کو ماننا پڑا اور آپ نے اس کو مٹایا۔ اور فرمایا کہ اللہ اکبر اسی سنت کے مطابق ہوا۔ خدا کی قسم میں محمدؐ بیہ کے دن رسول اللہ کا کتاب تھا اور محمدؐ رسول اللہؐ لکھا تھا، تو ان لوگوں نے کہا تھا کہ آپ رسول خدا نہیں ہیں لہذا اپنا اور اپنے باپ کا نام لکھے۔ رسول نے مجھ سے اس کے مٹانے کو کہا تو میں نے عرض کی کہ میری مجال نہیں کہ ایسا کر سکوں۔ آپ نے فرمایا اچھا مجھے دکھاؤ میں نے وہ جگہ دکھائی آپ نے اپنے ہاتھ سے اس کو مٹا دیا اور مجھ سے فرمایا کہ تم کو بھی ایسا ہی پیش آنے والا ہے اور پھر تم بھی ایسا ہی کرو گے۔ اس پر عمرو عاص نے کہا کہ سبحان اللہ تم ہم کو کافروں سے تشبیہ دیتے ہو۔ اس پر علیؑ نے کہا کہ کیوں زانیہ کے بچے تو کب فاسقین کا دوست اور مومنین کا دشمن نہ تھا۔ اس پر عمرو نے کہا کہ واللہ آج کے بعد ہم اور تم کبھی ایک جگہ اکٹھے نہ ہوں گے۔ تو علیؑ نے فرمایا کہ بے شک میں بھی امید کرتا ہوں کہ خدا میری مجلس کو تجھ سے اور تجھ ایسوں سے پاک رکھے گا، اس کے بعد صلح نامہ لکھا گیا۔

(البدایہ، ج ۱ ص ۷۷، طبع مصر)

اس موقع پر صاحب تاریخ اسلام نے بعض عیسائی مورخین کی رائے نقل کی ہے جو نقل کی جاتی ہے اور غور سے پڑھنے اور توجہ کے قابل ہے، (تاریخ اسلام ص ۲۰۵، باب پنجم طبع دہلی)۔

گبن لکھتا ہے کہ امیر شام بھاگنے کا تہیہ کر رہا تھا لیکن یہ یقینی فتح فوج

کے جوش اور نافرمانی کی بدولت علیؑ کے ہاتھ سے چھین لی گئی۔ علیؑ مجبور ہوئے کہ اُس پر توہینِ صلح اور عیارانہ صلح کو منظور کر لیں، وہ رنج اور حقارت آمیز غصہ سے کوفہ واپس آئے۔ ایرونگ کہتا ہے اشتر انھیں یعنی شامیوں کو دباتا ہوا خیموں کے قریب لیے جا رہا تھا کہ شامیوں نے نیزوں پر قرآن بلند کر دیے۔ علیؑ کے سپاہیوں نے تلواریں پھینک دیں، علیؑ نے اُن سے کہا کہ یہ فریب ہے اور لڑائی پر آمادہ کیا، لیکن انھوں نے انکار کیا۔ اشتر کو بلایا گیا۔ جس وقت اس کے خنجر سے خون ٹپک رہا تھا اور کہتا جاتا تھا کہ اُسے شاندار فتح سے دھوکا دے کر روکا گیا۔ جو رجبی زیدان تمدنِ اسلام میں لکھتے ہیں کہ قریب تھا کہ علیؑ کے طرف دار معاویہ کے لشکر کو روند ڈالیں۔ عمرو عاص نے ایک ایسا جیلہ پیش کیا جس کے سبب سے خلافتِ اہل بیت کے ہاتھ سے نکل گئی اور بنی امیہ نے من مانی مراد پائی، جیلہ یہ تھا کہ جب معاویہ کی فوج شکست کھانے کے قریب ہو گئی تو عمرو عاص نے حکم دیا کہ قرآن شریف نیزوں پر بلند کر کے صلح کی استدعا کی جائے۔ چنانچہ نیزوں پر قرآن شریف دیکھ کر حضرت علیؑ کی فوج کے لوگ دھوکا کھا گئے اور خود حضرت علیؑ سے التوا جنگ کے لیے اصرار کرنے لگ گئے ناچار حضرت علیؑ کو جنگِ مکتویٰ کو بنا پڑی۔ اب جائے غور ہے کہ علیؑ کی فوج میں کس قسم کے لوگ آگھسے تھے۔

اشعث بن قیس سے معاویہ نے ایک لاکھ درہم کا وعدہ بھی کر لیا تھا، اور بقول اعثم کو فی خالد بن معمر کو امیر خراسان بنانے کا (نقل از تاریخ اسلام)، اشعث خود قتل امیر المؤمنین میں شریک (قبل ظہور خوارج ہی) اس کا رنگ یہ تھا کہ

اکبر الخوارج کہا جا چکا، اس کے دو بیٹے قتل امام حسین میں شریک، اس کی بیٹی امام حسن کی بیوی بن کر اپنے شوہر فرزند رسول کی قاتل۔ اصل یہ ہے کہ علیؑ کی فوج میں کچھ تو صاحب ایمان تھے اور زیادہ جاسوس، رشوت خوار دوست نادمین۔ بات یہ تھی کہ تعلیم اسلام کے خلاف اور اہلبیت رسولؐ کے خلاف جو اساس قائم کی گئی تھی اس پر یکے بعد دیگرے عمارت بلند ہوتی جا رہی تھی۔ خود غرضی، قوانین اسلام سے بے نیازی، پابندی شریعت سے آزادی، اہلبیت رسولؐ سے محبت کے عوض ان سے غفلت، اجنبیت بلکہ عداوت و نفرت کی وبا پھیلتی چلی جا رہی تھی صرف محدود انسانوں کے سوا۔ جنہیں اصول و فرامین میں خدا و رسولؐ سے واقعی دلچسپی تھی عوام صرف نام بدل کر اپنے قدیم عقائد و اعمال کے دلدادہ ہوتے ہوئے دائرہ اسلام میں آگئے تھے اور جب حضرت علیؑ کی عام بیعت ہوئی تو قہراً گذشتہ سلطنت کی رعیت حضرت علیؑ کی رعیت اور گورنر یا قاضی یا فوجی حضرت علیؑ کے گورنر، قاضی اور فوجی کہلانے لگے۔ اب جو مخالف کھل گئے ان کا اسی وقت پتہ چل گیا اور بعضوں نے چالاکی سے موقع کا انتظار کیا اور عداوت کا اعلان کھلم کھلا نہ کر دیا۔ علامہ ابن ابی الحدید نے اپنی شرح جلد اول ص ۱۱۶ پر برسلسلہ حالات بسر جو لکھا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ ان ظاہری بیعت کرنے والوں کا (جن کی تعداد کتنی ہی کچھ ہو) رنگ باطن کیا تھا۔

”ایک قوم صنعا میں تھی جو عثمان کی پیرو طرفدار تھی اور ان کے قتل کو بڑی اہمیت دیتی تھی۔ لیکن نہ ان لوگوں کا کوئی سردار تھا نہ ان کا باقاعدہ کوئی نظام تھا۔ لہذا ان لوگوں نے جو دل میں تھا اسے دل میں رکھا اور حضرت علیؑ کی بیعت کر لی“

اس قسم کی فوج یا رعیت پر کیا بھروسہ ہو سکتا تھا اور نہ اگر کہیں اعتباری آدمی ملتے تو دنیا دیکھتی کہ علیؑ و اولاد کیا کر سکتی ہے۔ خود امیر المومنینؑ نے فرمایا، ولکن لا رای لمن لا یطاع اس کے علاوہ مختلف اوقات میں آپؑ نے جو تمناؤں کی ہیں اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ آپؑ کو کون لوگوں سے سابقہ پڑا تھا۔ وہ وقت نہیں بھلایا جاسکتا کہ جب آپؑ کو اطلاع ملی کہ آپ کے علاقوں پر معاویہ کے آدمی قبضہ کرنے لگے ہیں اور آپؑ نے اپنے نام نہاد طرف داروں کو ابھارا اور وہ اس سے مس نہیں ہوئے تو اس وقت بہت تنگ دل ہو کر کیا کچھ نہ فرمایا۔ آخر فرمایا کہ:

”کاشش اتم سب کے بدلے ہمیں بنی فراس بن غنم کے ایک ہزار

سوار مل جاتے“ (بیح البلاغ خطبہ ماہی الالکوف)

لیکن چالیس ہزار بیعت کرنے والوں کے شمار میں ایک ہزار صاحبان اعتبار نہ نکلے۔ مختصر یہ کہ اہلبیتؑ کو ایسے ہی ناقابل وثوق مدعیان اسلام و ایمان سے سابقہ پڑا تھا، ان پر نہ تو بھروسہ ہی کیا جاسکتا تھا اور نہ (تباسی رسولؐ)، ان کو منافق کہہ کر قتل یا فوج سے باہر نکالا جاسکتا ہے۔

سید الشہداء علیہ السلام کی غیر ممکن التوصیف اور عظیم الشان قربانی پر نظر کر کے نا فہموں کی زبان پر بھی یہی جاری ہو جاتا ہے کہ فلاں شخص یا امام بھی امام حسینؑ کی طرح لڑ کے مر کیوں نہ گیا۔ کامنا ماکان لیکن یہ لوگ واقعات اور حالات سے یا تو قطعاً ناواقف ہوتے ہیں یا واقعات سے دانستہ چشم پوشی کرتے ہیں۔ یاد رکھنا چاہیے!

لے جس کی اطاعت نہ کی جائے اس کی بات کیا۔

کہ نتائج کا اندازہ کیے بغیر کسی اہم اقدام کا ارتکاب کوتاہ بینی ہے۔ حکمت و اخلاق کا متقاضی عقل و دیانت کا فیصلہ یہی ہے کہ ٹھیک ٹھیک وضع الشی فی محلہ پر عمل ہو۔ عیبت اور تہور میں امتیاز ضروری ہے۔ علم اور عین میں فرق کرنا لازم ہے۔ آل رسول کی فطری اور معدوم النظیر دانش مندی و حزم تہور نہ یا مجنونانہ حرکت سے کہیں ارفع و اعلیٰ تھی۔ اُن کا مطمح نظر صرف دین محمدی کا پھیلانا تھا اور اس کی دائمی بقا و استحکام کے سامان ہوتا کرنا تھے۔ اس لیے جس نے جب اور جو اقدام کیا برابر یہی (ترویج دین و تعلیم محمدی) ملحوظ رکھا اور اس نقطہ سے ہرگز تجاوز نہ کیا خود سرور کائنات اور امیر المومنین کے مذکورہ بالا حالات سے کچھ اندازہ ہو گیا ہوگا۔ انشاء اللہ آئندہ معلوم ہوگا کہ امام حسین علیہ السلام کے لیے جو علل و اسباب جان دیدینے کے تھے وہ امیر المومنین، امام حسن اور خود رسول اللہ کو حاصل نہ تھے، اور ان حضرات کے لیے جان نہ دے کر صبر و تحمل سے کام لینے کے جو وجوہ تھے وہ امام حسین کے وقت میں مفقود تھے۔

امیر المومنین کو چار و ناچار بادل ناخواستہ خون جگر پی کر صلح کرنا ہی پڑی۔ اگر اُن روحانی اذیتوں پر نظر کی جائے جن کی ہلکی سی تصویر کشی امیر المومنین نے اپنے بعض کلام میں کی ہے تو معلوم ہوگا کہ اگر حسین نے جان دے کر دنیا کو موحجرت بنا دیا ہے تو اصول (یعنی دین محمدی کی پابندی اور ترویج کے لیے علی نے بھی صبر کے موقعوں پر وہ کر دکھایا ہے جو حسین ہی کے باپ کا کام ہو سکتا ہے۔ معمولی انسانوں کا تو ذکر ہی کیا دیگر انبیاء (سوائے خاتم الانبیاء) بل کر بھی ایسا نہ کر سکتے۔ خطبہ شقشقیہ کے فقرات فصبرت و فی العین قذی و فی الحلق شجی، اری سرائی

نہا وغیرہ کس امر کی دلیل ہیں۔ معاویہ کے فرستادہ بُسر بن ابی ارطاة کے منظم کی خبر پر جو کچھ آپ نے ارشاد فرمایا ہے اُس کا ایک ٹکڑا ابھی ذکر کیا جا چکا ہے۔ اسی خطبہ کے یہ فقرات کیسے جگر سوز ہیں:

”خدا یا! میں ان لوگوں سے تنگ آ گیا ہوں اور یہ مجھ سے تنگ ہیں انھوں نے مجھے عاجز کر رکھا ہے اور خود مجھ سے خفا ہیں۔“

”خدا یا! ان کے بدلے مجھے اچھے لوگ دے اور میرے عوض انھیں ایسا آدمی دے جو ان لوگوں سے میری بہ نسبت بُرا تاؤ کرے۔“

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کی طرف داری کا دعویٰ کرنے والوں (بیعت کرنے والوں، رعیت یا سپاہی کہلانے والوں) میں کس قسم اور کس تعداد کے لوگ تھے۔ علامہ ابن ابی الحدید نے اس خطبہ کے متعلق لکھا ہے کہ یہ خطبہ آپ کے اواخرِ خطب میں ہے۔ آپ نے یہ خطبہ اُس وقت فرمایا ہے جب صفین کی جنگ ختم اور حکمین کا معاملہ ہو چکا تھا۔ (شرح نہج البلاغہ ج ۱ ص ۱۱۰ تا ص ۱۱۵) ناظرین نوٹ کر لیں چند ہی دنوں بعد انھیں لوگوں سے امام حسنؑ کو سابقہ پڑے گا۔ پھر غور کرنا چاہیے کہ ایسوں کو لے کر جنگ کرنے والا کیا پھل پاسکتا ہے۔ امیر المومنینؑ کے شکایات کی کوئی حد نہیں۔ چنانچہ ایک دوسرے خطبہ میں فرمایا ہے: منیت بسن لا یطیع اذا امرت ولا یجیب اذا دعوت یعنی مجھے ایسے لوگوں سے سابقہ پڑا ہے جنہیں حکم دیتا ہوں تو مانتے نہیں، جب بلاتا ہوں تو جواب تک نہیں

لے اس حال میں میں نے صبر کیا کہ انکے میں کشاکش اور حلق میں اچھوتھا اپنی لٹتی میرات دیکھ رہا تھا۔

دیتے (بالکل نہیں سنتے)۔ اس کی تفصیل شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید جلد ۱  
ص ۲۱۲ میں دیکھیے؛

”جب تمہیں دشمن کے مقابلہ کو گرمیوں کے موسم میں کہتا ہوں تو  
کہتے ہو کہ شدت کی گرمی ہے ذرا ٹھہر جائیے کہ گرمی گزر جائے۔ اور جب  
سردیوں میں کہتا ہوں تو کہتے ہو کہ چلے جا جاڑا ہے ذرا دم لیجئے کہ سردی  
جائے۔ سردی گرمی سے بچنے کے یہ سب بہانے ہیں“

(ملاحظہ ہو تفصیل شرح نہج البلاغہ ج ۱ ص ۴۰ خطبہ اما بعد  
فان الجهاد.... الخ) (اس کے علاوہ اسی شرح نہج البلاغہ کی  
ج ۲ ص ۳۸ و ج ۲ ص ۴۷ وغیرہ دیکھیے تو اندازہ ہو کہ علیؑ کی فوج کس  
قماش کی تھی)۔

الغرض جن دردناک الفاظ میں امیر المؤمنین نے ان منافقین کی ایذا رسانی  
کی شکایت کی ہے ان سے دل تھرا اٹھتا ہے اور صاحب بصیرت کا جگر خون ہو جاتا  
ہے ان پر صبر اور ایسے لوگوں کے ساتھ گزارہ کرنا علیؑ ہی کا جگر تھا اس وقت  
جب حکمین فیصلہ کرنے چلے تھے، دونوں طرف سے چار چار سو آدمی اپنے نرائندے  
کے ساتھ تھے اس وقت کی حالت ابن خلدون (ترجمہ) جلد ۴ ص ۳۷۵ دیکھنے  
کے قابل ہے۔ لکھتے ہیں کہ عمرو عاص کے ہمراہی، ہمراہیان ابن عباس سے اس  
درجہ زیادہ مطیع اور فرماں بردار تھے کہ جب کبھی معاویہ کا کوئی خط آتا تھا تو عمرو عاص

لے معاویہ کا قول اور پرگذا یعنی علیؑ کے قول کی تصدیق دشمن نے بھی کی۔

سے اس کے مضامین کو دریافت تک نہ کرتے تھے، لیکن اہل عراق ابن عباس سے امیر المؤمنین علیؑ کے خطوط کے مضامین کو پوچھتے تھے اور ان کو اخلاء مضامین کے ساتھ شہم بھی کرتے تھے۔ اس موقع پر ان آیات اور روایات کو پیش نظر رکھنا چاہیے جو زمانہ رسول کے مدعیان اسلام منافقین کے متعلق ہیں۔ جن سے اندازہ ہو گا کہ سچے ایمان داروں میں دغا باز مار آستین کا خلط ملط صرف علیؑ کے شکریوں کی خصوصیت نہ تھی بلکہ خود سرور کا گنا کے اصحاب میں بھی یہی حال تھا بس فرق یہ تھا کہ رسولؐ کے مقابلہ میں اگر کسی کی ایسی کھلم کھلا طرفداری کی جاتی جیسی علیؑ کے زمانہ میں ہوئی تو ایسے لوگ کافر کہلاتے اور اولاً تو جو منافقت کا فائدہ تھا یعنی بل کر نقصان پہنچانا وہ ان کو حاصل نہ ہوتا، ثانیاً جان سے بچ جاتے۔ مگر علیؑ کے مخالفوں کا ساتھ دینے والے کبھی تو خلیفہ کے طرفدار کہلا کے مسلمان رہے، کبھی اُمّ المؤمنین کے ساتھی کہلا کے مسلمان رہے کبھی خال المؤمنین کے طرفدار کہلا کر مسلمان رہے، کبھی زیادتی تعداؤں سے اجماع کے پابند ہو کر مسلمان رہے، اور اگر کچھ نہ ہوا تو سب سے بڑا عمدہ حربہ خطائے اجتہادی کے قلعہ میں محفوظ ہو کر مسلمان رہے اس لیے علیؑ کو رسولؐ کی تاسی کے علاوہ اس ذاتی دشواری کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ علامہ ابن ابی الحدید اپنی شرح منہج البلاغہ جلد ۱ ص ۹۹ پر لکھتے ہیں:

”امیر المؤمنین کے زمانہ میں اشعث بن جملہ منافقین کے ایک تھا۔ یہ شخص

امیر المؤمنین کے اصحاب میں اُسی طرح تھا جس طرح عبد اللہ بن ابی بن سلول

اصحاب رسولؐ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں تھا۔ (اشعث بن سلول) دونوں

اپنے زمانہ کے سرداران منافقین میں تھے۔“

امیر المؤمنین اور معاویہ کے درمیان جو صلح نامہ لکھا گیا ہے اس کے متعلق علامہ

ابن ابی الحدید کی عبارت ذیل اچھی خاصی بصیرت افروز ہے:

”جب حضرت علیؑ نے اپنے اور معاویہؓ و اہل شام کے درمیان صلح نامہ لکھنے کا ارادہ کیا تو کسی نے آپ سے دریافت کیا کہ آپ معاویہؓ اور اہل شام کے متعلق یہ اقرار کرتے ہیں کہ وہ لوگ مومن مسلمان ہیں تو آپ نے فرمایا کہ میں نہیں مانتا کہ معاویہؓ اور اہل شام مومن مسلمان ہیں معاویہؓ کو اختیار ہے جو چاہے جیسے چاہے لکھے اور اپنے اور اپنے اصحاب کے لیے جو چاہے مانے اور اپنا اور اپنے اصحاب کا جو نام چاہے رکھ لے اس کے بعد لوگوں نے اس طرح معاہدہ نامہ لکھا یہ وہ حکم نامہ ہے جو علیؑ اور معاویہؓ کے درمیان ہوا ہے۔ علیؑ نے اہل عراق اور مومنین و مسلمین کی طرف سے جو ان کے تابع ہیں یہ طے کیا ہے اور معاویہؓ نے اہل شام اور ان مومنین و مسلمین کی طرف سے جو اس کے موافق خواہ ہیں یہ طے کیا ہے کہ ہم لوگ حکم خدا اور کتاب خدا کے پابند ہوں گے۔ کتاب خدا ہی ہم دونوں کے درمیان جامع قرار پائے گی اور ہمارے لیے از ابتدا تا انتہا کتاب خدا ہی معمول رہے گی (چنانچہ) ہم اسی کو زندہ رکھیں گے جس کو کتاب خدا زندہ رکھنے کو کہے گی اور جس کو قرآن ماننے کو کہے گا اسی کو ہم بھی مردہ بنائیں گے۔ اگر ایسی بات حکمین کو کتاب خدا میں مل جائے تو اس کی پابندی کریں گے، اور اگر نہ ملے تو پھر ایسی حکم سنت جس میں اختلاف نہ ہو (اس کی پیروی کریں)۔“

دونوں حکم عبداللہ بن قیس اور عمرو بن العاص ہیں۔ ان دونوں

نے علیٰ معاویہ اور دونوں کی فوجوں سے کل بات کا وعدہ لے لیا ہے کہ ان کی جان و مال اور ان کے اہل محفوظ رہیں گے اور امت ان کی مدد کرے گی۔ یہ دونوں حکم کتاب و سنت کے موافق جو فیصلہ جس کے لیے کریں گے اس پر عمل کرنے کا خدا سے عہدِ طرفین کے سب مومنین و مسلمین اور ہر شخص کی طرف سے ہو چکا ہے اور جب تک فیصلہ نہ ہو اس وقت تک کے لیے طرفین سے امن قائم رکھنے اور صلح جوئی اور سلاح استعمال نہ کرنے پر اتفاق کر لیا گیا ہے اور دونوں حکموں پر خدا کی طرف کا عہد لے لیا گیا ہے کہ امت میں جو فیصلہ کریں گے وہ حق کا فیصلہ ہوگا خواہشِ نفسانی کی پیروی میں فیصلہ نہ ہوگا۔ اسی عارضی صلح کی مدت پورا ایک سال ہے۔ اب اگر حکمین چاہیں تو جلدی بھی فیصلہ کرنے کا ان کو اختیار ہے۔ اگر ان دونوں کا کوئی وفات پا جائے تو اس گروہ کے امیر کو یہ حق ہوگا کہ اس کی جگہ کسی اور ایسے شخص کو منتخب کر لے جو حق و عدل کے خلاف نہ کرے، اور اگر دونوں امیروں میں سے کوئی وفات پا جائے تو اس کے معین کرنے کا بھی اس کے اصحاب ہی کو حق ہے کہ جس کی حکومت کو وہ لوگ پسند کریں اور جس کے طریقہ کو ممدوح سمجھیں مقرر کر لیں۔ خدایا! جو اس صلح نامہ کے خلاف کہے یا اس میں بے دینی اور ظلم کا ارادہ کرے اس کے خلاف ہم تیری مدد کے خواستگار ہیں۔“

باوجودیکہ امیر المومنین علیہ السلام نے از اول تا آخر فوج کی بے وفائی اور

غداری و مکاری سے اعلان بیزاری کر دیا تھا اور کل خطرات کی تشریح کر دی تھی، پھر بھی جہاں تک آپ کا بس چلا ہے اس عارضی صلح نامہ میں ایسے شرائط رکھوا دیے کہ اگر ان کی کچھ بھی پابندی کی جاتی تو معاویہ کو کسی طرح کامیابی ممکن نہ تھی اور جو اصل منقصد تھا یعنی کتاب و سنت کی ترویج لوگوں سے اس کا اقرار لینا اور اس کا پابند کرنا اور کتاب و سنت ہی کے پابند کو مدوح سمجھانا اور اس کے مخالف کو مذموم ثابت کرنا اور ان آوازوں کو عالم تک عموماً اور اہل شام و معاویہ شاہیوں تک خصوصاً پہنچا دینا، اُس کی پوری تبلیغ بھی ہو جاتی۔ لیکن جیسا کہ علی بن ابی طالبؑ نے بارہا علی الاعلان کہہ دیا تھا کہ معاویہ اور اس کے ہوا خواہ نہ اہل دین ہیں نہ اہل قرآن اس قدر سخت اور سختہ واضح غیر مبہم عہد نامہ کی بالکل اعلانیہ مخالفت کی گئی۔ (یہ دوسری بات ہے کہ آج تک عقیدت مند مدعیان اسلام معاویہ کو حق ہی پر سمجھے جائیں لیکن ساری دنیا تو اندھی نہیں ہے) عمرو عاص اپنی چال چلا، اور ابو موسیٰ سے جنہیں شروع ہی سے علیؑ کی مخالفت تھی باآسانی اس کے ہمنوا ہو گئے اور قرآن و حدیث کی کھلی ہوئی نفی کا داغ جس طرح معاویہ اور عمرو عاص کے پائے نام رہ گیا۔ ابو موسیٰ بھی قیامت تک اپنی پیشانی سے اس داغ کو نہ چھڑا سکے۔ عمرو عاص اور ابو موسیٰ کی صلح کے وقت کی گفتگو تمام مورخین نے قریب قریب ایک سی لکھی ہے۔ ہم علامہ ابن ابی الحدید کی عبارت نقل کرتے ہیں:

”نصر نے بیان کیا ہے کہ ابو حباب کلبی کی روایت ہے کہ جب عمرو اور ابو موسیٰ مقام دومۃ الجندل پر ملے تو عمرو نے گفتگو میں ابو موسیٰ کو مقدم کرنا شروع کر دیا اور یہ کہنے لگا کہ آپ نے مجھ سے پہلے صحبت رسول کا شرف پایا ہے مجھ سے

سن میں بھی بزرگ ہیں۔ لہذا پہلے آپ فرمائیے میں بعد میں بولوں گا اور آپس کی گفتگو میں عمرو نے یہی قاعدہ اور عادت مقرر کر لی۔ مگر اس میں مکرو فریب کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ صرف یہ مقصد تھا کہ ابو موسیٰ کو دھوکا دے کر پہلے بولوادے اور اس طرح وہ علیؑ کے معزول کرنے کا پہلے اعلان کر دے اس کے بعد پھر جو اپنی رائے ہے وہ تو ہے ہی۔ اور کتاب صفین میں ابن دیزیل نے لکھا ہے کہ عمرو نے ابو موسیٰ کو صدر مجلس میں جگہ دی اور اس سے پہلے کوئی گفتگو نہ کرتا تھا اور نماز جماعت میں بھی اسی کو آگے کیا، کھانے میں بھی اسی کو تھم رکھا کہ جب تک وہ نہ کھالے خود نہ کھاتا تھا، اور جب بھی ابو موسیٰ سے کلام کرتا تو اس کے لیے نہایت تعظیم کے آداب و القاب استعمال کرتا اور یوں کہتا کہ اے رسول اللہ کے صحابی۔ الغرض یہ حد ہوئی کہ ابو موسیٰ کو اطمینان ہو گیا اور یہ گمان کر لیا کہ عمرو ان کو دھوکا نہ دے گا۔ نصر راوی ہے کہ جب دونوں کے درمیان ”ہانڈی میں خوب اُبال اُچکا“ تو عمرو نے کہا کیوں ابو موسیٰ آپ کی کیا رائے ہے؟ (دل میں علیؑ کی مخالفت تھی ہی اس پر عمرو عاص کی تعظیموں سے پھولے نہ سماتے تھے) فرمانے لگے کہ بندہ کی رائے تو یہ ہے کہ (علی علیہ السلام و مساویہ) ان دونوں کو معزول کر کے مسلمانوں کی کمیٹی پر پھر چھوڑ دیا جائے وہ لوگ جس کو چاہیں منتخب کر لیں۔ عمرو فوراً بول اٹھا خدا کی قسم رائے تو بس یہ ہے جو آپ نے تجویز فرمائی ہے۔“

(شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید ج ۱، ص ۱۹۸)

اوپر جو صلح نامہ بیان کیا گیا ہے علامہ ابن ابی الحدید نے اس کے علاوہ اور بھی

روایتیں نقل کی ہیں۔ چنانچہ ایک میں یہ فقرے بھی ہیں :

”حکیمین حکم کتاب اللہ سے ہرگز تجاوز نہ کریں گے اور اگر ان دونوں

نے کتاب خدا کی بات زبانی تو امت اسلامیہ ان سے بیزار ہوگی اور ان

کے عہد کا کوئی اعتبار نہ ہوگا اور کسی قسم کی ذمہ داری نہ رہے گی“

لیکن باایں ہمہ عمرو عاص نے جو چال اختیار کی وہ از سر تا پا خلافتِ حکم کتاب و سنت

رہی صاف صاف فریب، دھوکا اور مکر سے کام لیا۔ مسلمان تو مسلمان کوئی با عقل

و شرافت انسان اس کو بجز نفرت و حقارت اور کسی طرح نہیں دیکھ سکتا۔ ابو موسیٰ

کو آخر آخر تک سمجھایا جا رہا تھا کہ فریب نہ کھائیں (مگر جب ارادہ بھی تو ہو، وہاں

تو دل کسی اور ہی طرف تھا۔ ظاہر ہے کہ اشعث نے بے سمجھے بوجھے تو ابو موسیٰ پر زور

نہیں دیا تھا، جب فیصلہ سننے کا وقت قریب آ رہا تھا اور ابو موسیٰ نے کہا تھا کہ

”ہم دونوں کی رائیں ایک ایسے امر پر متفق ہو گئی ہیں جس میں امید ہے کہ امت کی

بھلائی اور صلاح ہوگی۔ عمرو عاص نے بھی اس کی تصدیق کی اور کہا کہ ٹھیک کہتے

ہو۔ اے ابو موسیٰ آگے بڑھو اور جو طے ہے کہہ دو، جوں ہی ابو موسیٰ آگے ہوئے“

”تو ابن عباس ابو موسیٰ کے نزدیک چلے گئے اور فرمایا کہ اگر عمرو

عاص نے تم پر یہ ظاہر کیا ہے کہ اس کو تمہاری رائے سے اتفاق ہے تو

واللہ میں خیال کرتا ہوں کہ اس نے تم کو دھوکہ دیا ہے۔ اس لیے مناسب

معلوم ہوتا ہے کہ پہلے عمرو عاص ہی کو تقریر کرنے کا موقع دو ورنہ پھیناؤ گے

ابو موسیٰ نے اس بات پر کچھ اعتناء نہ کیا اور کھڑے ہو کر بعد حمد و ثناء الہی

کہا کہ ایہا الناس! میری اور عمرو عاص کی رائے متفق ہو چکی ہے کہ علیؑ اول

معاویہ دونوں علیہہ کر دیے جائیں اور مسلمانوں کا گروہ غمور کرنے کے بعد جس کو چاہے اپنا خلیفہ مقرر کر لے۔ لہذا میں نے علیؑ و معاویہ دونوں کو معزول کیا اب تم لوگ اپنے آئندہ امور کی طرف متوجہ ہو کر جس کو اس امر کا اہل سمجھو مقرر کر لو۔ یہ کہہ کر پیچھے ہٹے اور عمر و عاص اُس جگہ کھڑا ہوا۔ خدا کی حمد و ثنا ظاہر کر کے یہ کہا کہ جو کچھ اُس شخص نے کہا وہ آپ لوگوں نے سُن لیا اور اس شخص نے اپنے والی کو معزول کر دیا۔ تو جس طرح اُس شخص نے معزول کر دیا میں بھی اس کے والی کو تو معزول کرتا ہوں لیکن اپنے والی کو ثابت کرتا ہوں“

(ابوالفداء ج ۱ ص ۱۷۸، مطبع حینیہ مصر)

صحابیت کی امداد و ہند تغظیم ہی نے اسلام کو پارہ پارہ کر دیا ہے اور اہلبیت کا غیر مشروط احترام جو بر بنائے بلندی ایمان و عمل صالح قرآن اور سرور عالم کے فرمان میں بکثرت واجب قرار دیا گیا ہے پس پشت ڈالنے کا ذریعہ بنایا گیا ہے۔ کاش صحابیت کے ہر بونگ میں ایمان و عمل صالح کی پرکھ بھی ملحوظ کر لی گئی ہوتی، اور ہمیشہ نہیں تو گاہے گاہے تو ”ایمان و عمل صالح“ کو قابل التفات سمجھا جاتا۔ لیکن ایمان و عمل کی کسوٹی اور صحابیت کا سن پروف (Sinn Proof) دو متضاد حقیقتیں کیوں کر ملحوظ ہو سکتی تھیں۔ مختصر یہ کہ ابو موسیٰ جن کا علیؑ سے انحراف مسلم ہے۔ (دیکھو استنباط جلد ۲ ص ۶۷۸ کتاب الکنی حرف اللام والمیم طبع حیدرآباد) کیونکہ ان کو بھی تو علیؑ نے حکومت (کے لغز تر) سے معزول کیا تھا۔ ان صحابی صاحب کی دیانت کا حال تاریخ کامل ابن اثیر ج ۴ ص ۵ کی اس عبارت سے بھی چلتا ہے :

”ابو موسیٰ اشعری معاویہ کے پاس بَرنس اسود (ایک قسم کی کالی

ٹوٹی جو حکومت کے لوگ پہنتے ہیں، پہن کر آئے اور (معاویہ کو اس طرح سلام کیا) "السلام علیک یا امین اللہ" یعنی اسے امینِ خدا تم پر سلام ہو۔ معاویہ نے دعویٰ کیا تو کہا مگر جب ابو موسیٰ چلے گئے تو کہا کہ یہ بڑھا حکومت لینے آیا تھا۔ خدا کی قسم میں اس کو کہیں کا بھی والی نہ بناؤں گا۔"

ناظرین پر واضح ہو گیا ہو گا کہ حضرت علیؑ کس درجہ مجبور ہو گئے تھے اگر صلح نہ کرتے تو کیا کرتے۔ یہ بھی واضح ہے کہ امیر المؤمنینؑ کے اس عمل سے اسلام کو فائدہ ہی پہنچا، اگر آپ صلح نہ کر لیتے تو جیسا کہ ان رشوت خوار منافقین نے تصریح کر دی تھی آپ کو آپ کی فوج قتل کر ڈالتی۔ جس فوج میں اشعث جیسے سردار ہوں، جس فوج کی طرف سے ابو موسیٰ جیسے لوگ حکم بنائے جائیں۔ جس فوج کا حال وہ ہو جس کی تصریح اور پرامیر المؤمنینؑ کی زبان سے ہو چکی، جس کی حالت خود معاویہ کی زبانی لکھی جا چکی۔ جس کی کارستانیاں تاریخ میں آج بھی باوجود اخفا رہ کثرت موجود ہیں اس فوج پر بھروسہ کر کے جنگ جاری رکھنا یا جنگ کر کے اپنے ہاتھوں اپنا اور اپنے مخلصین کا خون کرنا کب زیا ہو سکتا ہے۔ اس موقع پر مقتضائے دانشمندی یہی تھا کہ اپنے آپ نیز معدودے چند اصحاب خاص کو زندہ رکھ کر ان اصول اور احکام کو زندہ رکھا جائے جو انہی چند نفوس کے ساتھ وابستہ تھے اور معاویہ اور اس کے ہم رنگ جماعت کے ایمان و اعمال کو دنیا کے

لے قرآنِ ہدایت عقل سب کی اس طرح کھلم کھلا مخالفت کے باوجود معاویہ کے طرفدار مدعیانِ اسلام معاویہ علیؑ یا علیؑ کے طرفدار نہ تھے، بلکہ آج تک معاویہ کو سراہے جاتے ہیں۔ انہیں لوگوں سے امامِ حسنؑ کا آئندہ سابقہ ہونے والا ہے۔ کیا عقل اجازت دیتی ہے کہ حسنؑ بھی لڑکر آئندہ را آموزوں پر عمل کر کے مقصدِ اصلی کو فنا کر دیں۔

سامنے الم نشرح کر دیا جائے اور خاص کر وہ مدعیان پاکبازی مسلمان جنہوں نے صحابیت کے پردہ میں اسلام کشی کا بیڑا اٹھا رکھا تھا ان کے پردہ کو چاک کر دیا جائے اور واقعات میں ایسی نوعیت پیدا کر دی جائے کہ علیؑ اور ان کے مخلص پیروؤں کی دین داری اور معاویہ اور اس کے ہم نواؤں کی مخالفت چھپنے نہ چھپ سکے۔ لوگ سمجھیں کہ ان دو لڑنے والوں میں دین اسلام، حکم قرآن اور سنت خیر الانام کا حافظ اور نگہبان خود پابند اور دوسروں سے اسی کی تمنا کرنے والا اور حکومت الہیہ کا حقدار کون ہے اور اس کے مخالف کون۔ چنانچہ مذکورہ بالا طریقوں سے گو معاویہ کی حکومت ان حدود میں جم گئی جہاں برسوں قبل سے قائم کی گئی تھی۔ لیکن معاویہ کے حالات ایسے طشت از بام ہوئے کہ مسلمان تو مسلمان غیر مسلمان بھی وہ کچھ لکھ گئے جو ایک غیرت دار مسلمان کے لیے عبرت کا تازیانہ ہے۔ ابو قیس ازدی کی روایت استیعاب یہ ہے کہ میں نے لوگوں کو تین قسم کا پایا۔ ایک اہل دین جو حضرت علیؑ کو دوست رکھتے ہیں، دوسرے اہل دنیا جو معاویہ کو چاہتے ہیں، تیسرے خوارج۔

واہ رے اس زمانہ کے اصحاب اور تابعین اس قدر علی الاعلان کتاب خیر، سنت رسولؐ اور عہود اسلامیہ کی مخالفت و معاندت کی جاتی ہے معاویہ کا ساتھ نہیں چھوڑا جاتا (حکیمین جب فیصلہ کے لیے جمع ہوئے تھے اس وقت دونوں طرف سے چار چار سو آدمی گئے تھے جن میں صحابہ کی کافی تعداد بھی موجود تھی)۔ اس زمانہ کا تو ذکر ہی کیا کم از کم حکومت یا دسترخوان اور جاگیر و عطیہ کا لالچ تھا۔ تعجب تو آج کے عقیدتمندوں پر آتا ہے آج کچھ بھی نہیں رہا۔ پھر بھی اس شخص سے بیزاری کا اعلان نہیں کیا جاتا جس کے حق میں علیؑ بن ابی طالب نے بے دینی کا اعلان کر دیا اور پھر

علیؑ کو بھی خلیفہ راشد اور علی الحق کہا جا رہا ہے۔ حکمین کا فیصلہ ہو گیا، حکومت اسلامیہ کے دو ٹکڑے بن گئے۔ اب نیا شگوفہ یہ کھلتا ہے کہ وہی لوگ جنہوں نے علیؑ سے جنگ روکنے پر اصرار کیا، انہوں نے مالک اشتر کو بلانے پر اصرار کیا۔ علیؑ کی مرضی کے مطابق حکم مقرر نہ ہونے پر اصرار کیا۔ ابو موسیٰ کے حکم بنانے پر اصرار کیا، ان الحکمہ اللہ کی بے جا صدا بلند کرنے لگے اور علیؑ کے مقابلے کے لیے ایک دوسرا گروہ اور تیار ہو گیا یعنی خوارج۔ امیر المؤمنینؑ نے علی الاعلان بتلادیا کہ ”دیکھو جن دو حکموں کو تم نے اختیار کیا تھا ان دونوں نے کتاب خدا کے حکم کو پھینک دیا، جس بات کو قرآن نے مٹا دیا تھا انہوں نے اسے زندہ کر دیا۔ دونوں نے اپنی نسانی خواہشوں کی پیروی کی، جو فیصلہ کیا نہ تو اس کی کوئی دلیل ہے نہ بینہ، نہ کوئی سنت ہے پھر یہ بھی کہ جو فیصلہ کیا اس میں اختلاف۔ مختصر یہ کہ دونوں نے گمراہی اختیار کی۔ لہذا اب جہاد کے لیے تیار ہو جاؤ اور چڑھائی پر آمادہ ہو۔ ترجمہ ابن خلدون جلد چہارم ص ۳۸۳ پر یہ الفاظ بھی موجود ہیں:

”امیر المؤمنینؑ کو ان واقعات کی اطلاع ہوئی تو آپ نے اپنے لشکریوں سے خوارج کی جنگ پر دوبارہ بیعت لی، پھر ان کو حکمین کے فیصلہ کا خیال آیا جو شاق و ناگوار گذر رہا تھا، آپ نے ایک خطبہ دیا جس میں بعد حمد و درود اور نصائح و پند کے بیان فرمایا اسے لوگو! آگاہ رہو کہ حکمین نے قرآن کے حکم کو چھوڑ کر ہر ایک نے اپنی خواہش کی اتباع کی اور دونوں

نے فیصلہ کرنے میں اختلاف کیا، اور دونوں راہِ راست سے علیحدہ ہو گئے،  
پس اس حکم و فیصلہ سے اللہ اور اس کا رسول اور صلحاء امتِ بری میں لہذا  
تم لوگ شام پر حملہ کرنے کی تیاری کرو۔“

اس کے بعد ابنِ خالدون نے اسی عبارت کے سلسلہ میں یہ کہہ لیا کہ :  
”خطبہ دینے کے بعد خوارج کے پاس نہروان میں ایک فرمان لکھ  
بھیجا جس میں اس خطبہ کا مضمون تھا اور ان کو اہل شام پر حملہ کرنے کو ابھارا  
تھا، صاف الفاظ میں لکھ دیا تھا نحن علی الامر الاول الذی کنا  
علیہ (ہم اسی پہلی رائے پر ہیں جس پر اس سے پیشتر تھے یعنی اہل شام  
سے جنگ کریں گے)۔“  
خوارج نے جواب میں لکھا :

”تم نے بوقتِ تقرّر حکمین اللہ تعالیٰ کا پاس نہ کیا اور اب اپنے  
نفس کے اتباع سے لڑنے کو کہتے ہو۔ پس اگر تم اپنے کافر ہونے کا اقرار  
کرو اور توبہ کرو تو ہم تمہارے ساتھ ہیں ورنہ ہم تم سے برابری کے ساتھ  
لڑنے کو تیار ہیں۔“

امیر المؤمنین علیؑ کو اس خط کے پڑھنے سے ناامیدی ہو گئی، لیکن ان کو زیادہ  
مضر و خطرناک نہ تصور کر کے شام پر حملہ کرنے کا قصد مصمم کر لیا۔ لوگوں کو برابر جنگ

---

لے قابلِ غور ہے کہ خوارج سے زیادہ خطرناک علیؑ کے نزدیک شامی تھے اور انہیں  
لوگوں سے امامِ حسنؑ کا سابقہ ہو گا۔

کی ترغیب دینے لگے۔ ابن عباس کو لشکر گاہ نخیلہ سے فوج مرتب و مہیا کرنے کو لکھا انھوں نے ایک ہزار پانچ سو جنگ اور سپاہی بسر کر وہی اخف بن قیس مجتمع کر لیا پھر دوبارہ ابن عباس نے لوگوں کو مجتمع کر کے امیر المؤمنین کا فرمان پڑھا اور یہ بیان کیا کہ بڑے افسوس کا مقام ہے کہ تم لوگ ساٹھ ہزار ہو جس میں سے صرف ایک ہزار پانچ سو نے جنگ پر آمادگی ظاہر کی ہے۔ اس قلیل تعداد کو میں کیا بھیجوں۔ اس فقرے کے تمام ہوتے ہی ایک ہزار چھ سو آدمیوں نے سینہ سپر ہو کر کہا، ہم جنگ پر جانے کو تیار ہیں۔ پس ابن عباس نے ان کو حارثہ بن قدامہ سعدی کے ساتھ روانہ کیا۔ چنانچہ اخف اور حارثہ تین ہزار ایک سو کی جمعیت سے امیر المؤمنین کی خدمت میں جا پہنچے امیر المؤمنین علیؑ نے اہل کوفہ کو جمع کر کے خطبہ دیا جس میں اہل بصرہ کی امداد کا حال بیان کیا۔ بعد ازاں نہایت نرم الفاظ میں پسند و نصیحت کر کے ارشاد فرمایا کہ تم لوگ میرے معاون و مددگار ہو، مناسب ہے کہ ہر سردار اپنے گروہ قبیلہ کی ایک فہرست تیار کر کے پیش کرے کہ ان میں کس قدر جنگ اور سپاہی ہیں۔ سعد بن قیس ہمدانی، معقل بن قیس، عدی بن حاتم، زیاد بن حصہ، حجر بن عدی اور بڑے بڑے سرداروں رئیسوں نے بسر و چشم اس حکم کی تعمیل کی اور کسی تنفس کو جو قابل جنگ تھا باقی نہ چھوڑا۔ فہرست تیار ہونے پر معلوم ہوا کہ چالیس ہزار نبرد آزما تجربہ کار ستترہ ہزار نوجوان، آٹھ ہزار خادم میدان جنگ میں جاسکتے ہیں۔ علاوہ ان کے تین ہزار ایک سو سپاہی بصرہ کے تھے۔ بعد اس کے امیر المؤمنین نے یہ خبر پا کر کہ لوگ جنگ خوارج کو مقدم سمجھتے ہیں ارشاد کیا، اہل شام پر فوج کشی کرنا زیادہ ضروری ہے کیونکہ انھوں نے تم سے مقابلہ کیا، برابر لڑتے رہے۔ ان کا مقصود یہ ہے کہ وہ بزور و جبر بادشاہ بن جائیں اور

بندگان خدا کو اپنا غلام بنائیں۔ لوگوں نے اس رائے کو پسند کیا اور متفق ہو کر بولے، ہم آپ کے ہمراہ ہیں، جہاں اور جس طرف مناسب سمجھے رخ کیجئے۔

ابھی امیر المومنین اہل شام کی طرف روانہ ہونے بھی نہ پائے تھے کہ خوارج نے ہنگامہ برپا کر دیا، لوگوں نے امیر المومنین کو پہلے خوارج سے نہٹ لینے کو کہا۔ امیر المومنین کو مجبوراً خوارج سے پہلے اتمام حجت کرنا پڑا، چنانچہ خط و کتابت فہمائش شروع ہوئی۔ مورخ ابن خلدون نے مختلف گفتگو جو خوارج سے ہوئی ہے بیان کی ہے ان میں سے ایک یہ ہے جو ترجمہ جلد چہارم ص ۳۸۶ پر مذکور ہے:

”قیس بن سعد بن عبادہ اور ابویوب انصاری نے یکے بعد دیگرے

ان لوگوں کو وعظ و پند کیا، پھر خود امیر المومنین علیؑ نے خشونت آمیز الفاظ میں ان لوگوں کو سمجھایا، ان کی رائے کی غلطی ظاہر کی اور حکمین کی نسبت فرمایا کہ چونکہ انھوں نے کتاب اللہ، سنت رسول اللہ کے خلاف حکم دیا ہے اس وجہ سے ہم نے ان کے فیصلہ کو منظور نہیں کیا اور ہم اپنے اسی خیال پر ہیں جو اس سے پیشتر تھا۔ علاوہ بریں حکم کے مقرر کرنے کو تم ہی لوگوں نے زیادہ زور دیا تھا۔ خیر جو گذر گذرا، اب تم لوگ ہمارے ساتھ چلو اور دشمنوں سے لڑو۔ خوارج نے کہا بے شک ہم لوگوں نے حکم کے مقرر کرنے میں غلطی کی، اللہ و رسول کے حکم کے خلاف کیا، کافر ہوئے۔ لیکن توبہ کر کے پھر مسلمان ہو گئے۔ پس اگر تم بھی توبہ کرو تو ہم تمہارے ساتھ ہیں اور اگر اس سے انکار کر دو گے تو ہم تم سے مخالفت کریں گے“

لیکن تمام مجتہدوں کے پورے ہونے کے باوجود بھی خوارج سیدھے نہ ہوئے

اور نہروان کی جنگ کو مقدم کرنا پڑا۔ اس جنگ کے حالات اور امیر المومنینؑ کے وہ معجزات جو اس جنگ میں ظاہر ہوئے ہیں قابل دید ہیں۔ مختصر یہ کہ اس جنگ میں بھی علی علیہ السلام کو شاندار کامیابی ہوئی۔ اس کے بعد کے متعلق علامہ ابن خلدون یہ لکھتے ہیں:

”نہروان جنگ سے فارغ ہونے کے بعد امیر المومنین علیؑ کا قصد اہل شام کی طرف بڑھنے کا تھا، لیکن لشکریوں نے تھک جانے اور تیر اور نیزوں کے زخموں کی شکایت کی اور کوفہ میں واپس چلنے کی درخواست کی تاکہ چندے آرام کر کے دشمنوں پر کمال مردانگی و مستعدی سے حملہ کریں۔ شاید اس اثناء میں ہماری تعداد بھی بڑھ جائے۔ اس گفتگو کے کرنے پر اشعث بن قیسؓ مامور کیے گئے تھے۔ امیر المومنین علیؑ نے اس امر کو منظور نہ کیا۔ ساتھ ہی اس کے شام کی طرف بھی نہ روانہ ہوئے بلکہ کوفہ کو لوٹے اور مقام نخیلہ میں پہنچ کر قیام کر دیا اور عام حکم دے دیا کہ کوئی شخص اپنے مکان پر نہ جائے جب تک دشمنوں کی طرف خروج نہ کر کے فتحیاب ہوئے۔ لیکن زمانہ قیام لشکر گاہ میں اکثر لوگ لشکر گاہ خالی چھوڑ کر اپنے اپنے مکانوں پر چلے آئے۔ امیر المومنین علیؑ چھڑائی کو خالی دیکھ کر ان لوگوں کے پاس آئے اور دوبارہ لڑائی کی ترغیب دی، معدودے چند آدمیوں نے مستعدی ظاہر کی پھر چند روز ٹھہر کر اس کے سرداروں اور رئیسوں کو طلب کر کے ان کی رائے

لے اگر علم غیب نہیں مانا جائے تو بھی تجربہ سے ثابت ہو چکا کہ اشعث کا ظاہر کیا تھا باطن کیا تھا۔ ایسے شخص کی رائے پر بھروسہ کیوں کر کیا جاسکتا تھا۔

دریافت کی اور تاخیر کرنے کی وجہ استفسار کی۔ ان لوگوں میں سے نہایت کم آدمیوں نے شام پر فوج کشی کی خوشی ظاہر کی۔ امیر المومنین علیؑ کا چہرہ اس سے سرخ ہو گیا۔ طول خاطر لٹھے، خطبہ دیا، سختی سے تقریر کی، اُن کے فرائض سے ان کو مطلع کیا، نصیحت نصیحت بہت کی لیکن کسی کے کان پر جوں تک زربنگی بُت کی طرح خاموش بیٹھے رہے۔“

حالات سے ناواقف لوگ خصوصاً غیر مسلم مورخین جو زیادہ تر محض انہیں اور اتنے ہی حالات سے مطلع ہوتے ہیں جو جناب امیر علیہ السلام کے مخالف کیمپ سے نکلتے ہیں اور جنہیں یہ قطعاً معلوم نہیں کہ خلافت کے معاملہ میں اگرچہ حضرت علیؑ کو چوتھی جگہ شمار کیا جاتا ہے مگر (باوجود اس دقت خلیفہ ماننے کے بھی) اُن سے ویسی بہرہ ردی نہیں جیسی گزشتہ خلفاء سے تھی، بلکہ علیؑ سے تو اُن کے مخالف (مگر مدعیان اسلام) مسلمانوں کو اتنی بھی بہرہ ردی نہیں جتنی معاویہ سے ہے۔ حضرت علیؑ کے لیے اس موقع پر تاخیر جنگ کا الزام لگانے والے غور نہیں کرتے کہ ایسی فوج کے بل پر کیونکر لڑائی لڑی جاسکتی تھی۔ علامہ ابن خلدون جو مورخین میں مخالفت اہلبیتؑ کا بڑا پکا علمبردار ہے ابھی اس کی تحریر ملاحظہ کی گئی اس کے بعد بھی کسی اعتراض کا محل حضرت علیؑ کے حق میں ہو سکتا ہے ہرگز نہیں!

جب امیر المومنینؑ کی نصیحت نصیحت امر زجر کسی کا اثر نہ ہوا تو آپ مجبوراً دارالسلطنت (کوفہ) کی طرف لوٹے۔ تاریخ اسلام باب ۵ ص ۲۲۰ سے واضح ہوتا ہے کہ حکمین کے قضیہ کے بعد ایک خط و کتابت امیر المومنینؑ اور معاویہ سے ہوئی

ہے اور معاویہ کی روزانہ کی غارت گری سے محفوظ رکھنے کے لیے یہ معاہدہ بھی وقتی طور پر ہوا ہے کہ شام و مصر میں معاویہ اور عراق و دیگر اسلامی علاقوں میں علی مرتضیٰ کا قبضہ رہے۔ وہاں پہنچ کر شام پر حملہ کی فکر ہی میں تھے کہ اسی اشار میں دشمنوں کی نیش نے اپنا کام پورا کر لیا۔ نبض رسولؐ پر جب آپ روزہ رکھے ہوئے مسجد میں نماز میں مشغول تھے کہ اشقی الآخرین عبد الرحمن بن ملجم کی زہر آلود تلوار چل گئی اور آپ خدمت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں جا پہنچے۔ سازش کے ایک جزو برک کو معاویہ پر حملہ کرنے کے جرم میں گرفتار کیا گیا تو بقول ابن اثیر (ج ۳، ص ۱۵۷) اس نے معاویہ سے خطاب کیا کہ میں آپ کو ایک خوشخبری سناتا ہوں۔ بتلائیے اگر خوشخبری سناؤں تو مجھے اس سے کوئی فائدہ پہنچے گا۔ اُس نے کہا ہاں!۔ تب اس نے کہا کہ میرے ایک بھائی نے آج ہی رات کو علیؑ کو قتل کر ڈالا۔ معاویہ نے کہا ممکن ہے کہ اس کو موقع نہ ملا ہو۔ برکت نے کہا کہ ایسا کیونکر ہو سکتا ہے، علیؑ کے ساتھ تو کوئی محافظ نہیں ہوتا (اس روایت میں اس کے بعد اس کو قتل کیے جانے کا حال لکھا ہے) اور بعض لوگوں نے کہا ہے کہ (یہ سن کر) معاویہ نے برک کو قتل سے معاف کر دیا۔ اُس کے ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالے اور وہ اس وقت تک زندہ رہا جب کہ زیاد بصرہ کا حاکم ہوا اور برک وہاں رہا۔ اُس کی اولادیں بھی ہوئیں۔ مختصر یہ کہ خواہ کسی کی سازش رہی ہو علیؑ کی شہادت واقع ہو گئی۔ تاریخ اسلام میں ہے:

”مسعودی کہتا ہے کہ بعض لکھتے ہیں کہ وفات کے وقت علی مرتضیٰ نے

امام حسنؑ اور ان کے بعد امام حسینؑ کو اپنا وصی کیا کیونکہ آیت تطہیر میں یہ بھی حضرت کے ساتھ شریک ہیں اور یہ قول اکثر ان لوگوں کا ہے جو نص کے قائل

ہیں۔ الحقد الفرید، روضۃ الاحباب، حبیب السیر، وسیلۃ النجاة، طابمین، نزول الابرار اور سراجلیل مولوی عبدالعزیز دہلوی میں بھی یہی ہے کہ حضرت علیؑ نے وقت وفات امام حسنؑ کو اپنا جانشین کیا تھا۔ ابوالفدا طبری، مسعودی اور ابن اثیر و ابن خلدون وغیرہ نے لکھا ہے کہ (جب آپ زخم کھائے پڑے ہوئے تھے) لوگوں نے حضرت سے پوچھا کہ یا حضرت اگر خدا نخواستہ آپ کا انتقال ہو جائے تو ہم حسنؑ کی بیعت کر لیں، حضرت نے فرمایا میں تو کچھ ہاں یا نا نہیں کہتا، تم خود ہی سمجھ دار ہو۔“

امیرالمومنینؑ کی شہادت کے بعد خواہ بہ وصیت و خواہ بہ بیعت اب امام حسن علیہ السلام کی خلافت ان حالات میں شروع ہوتی ہے۔ اشعث نے جنگ نہروان کے بعد امیرالمومنینؑ کی رائے جنگ اہل شام کی کھلم کھلا مخالفت کی وہ ظاہر ہی ہے۔ سمجھ میں آسکتا ہے کہ اس کے اندر کتنے اور ہوں گے، اور بقول ابن خلدون امیرالمومنینؑ کے اصرار اور نصائح و فضاخ کے باوجود لوگ چھاؤنی چھوڑ کر بھاگ گئے اور ایسے بھاگے کہ باوجودیکہ امیرالمومنینؑ خود ان کے پاس گئے، پھر بھی ”نہایت کم آدمیوں“ نے آمادگی ظاہر کی جس سے آپ کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ شام پر حملہ میں یہ لیت و لعل جاری تھی کہ امیرالمومنینؑ کی شہادت ہوئی۔ مذکورہ بالا حالات سے خوب اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ امام حسنؑ کو کتنے اور کیسے سپاہی ملے اور ان کو لے کر کیا اہم اقدام ہو سکتا ہے۔ ادھر تو حسنؑ کے گھر علیؑ کا ماتم تھا اور پھر ایسے نامعقول اور ناہنجار سپاہیوں کا ساتھ تھا۔ آپ کی خلافت کا ہونا تھا کہ معاویہ ایک دم ساٹھ ہزار فوج لے کر امام حسنؑ کے مقابلہ

کے لیے مقام مسکن پر آپہنچا۔

چونکہ میرا خطاب ابھی تک شیعوں سے ہے اور صرف ان کی تسلی کے لیے یہ سب کچھ لکھ رہا ہوں بتانا چاہتا ہوں کہ امام کے معصوم مفترض الطاعة ہونے سے اگر قطع نظر بھی کی جائے جب بھی مقتضائے اصول و دانش مندی یہی تھا، یعنی صلح کر لینا اور اسی امر کو ملحوظ رکھ کر رسول خدا اور علی مرتضیٰ کے حالات صلح لکھے گئے ہیں کہ اگر صلح حسن قابل اعتراض ہے یا سمجھ میں نہیں آتی تو پھر وہی اعتراض رسول اور وصی رسول پر بھی کیوں نہیں کرتے صرف امام حسن ہی کی کیا خصوصیت ہے۔ یہ بار بار عرض کر چکا کہ ان حضرات کے اقدام کو حکمت، عدالت، شریعت اور انسانیت کے قانون کا لحاظ کر کے دیکھنا چاہیے، صرف نام آدرسی اور دکھاوے کی شجاعت اور ہوائے نفس و زمانہ کی پابندی یہ حضرات ہرگز نہ کرتے تھے نہ ان کو ایسا زیبا تھا نہ ان کا مقصد ایسی سلطنت قائم کرنا تھا جس کا نام تو اسلامی ہو اور اس کے احکام اور حکام کا عمل خدا و رسول کے خلاف حکم ہو۔ صاحب تاریخ اسلام نے اس موقع پر ایک سوال نقل کیا ہے اور خود امیر المؤمنین کا جواب بھی نقل کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”صفین سے واپسی کے وقت راستہ میں عبد اللہ بن دلیع الانصاری جناب امیر سے ملے اور کہا کہ اکثر لوگ آپ پر اعتراض کرتے ہیں کہ آپ نے بقیہ اطاعت شعاروں کے ساتھ دشمنوں سے جنگ کیوں نہ کی، فتح پاتے یا شہید ہو جاتے۔ نافرمانوں کی آپ پروا نہ کرتے۔ حضرت نے فرمایا، حسن و حسین شہید ہو جاتے اور نسل پیغمبر قطع ہو جاتی اور یہ مجھے منظور نہ ہوا حسین کے بعد عبد اللہ بن جعفر اور محمد بن حنفیہ بھی شہید ہو جاتے اب میں کسی جنگ

میں انھیں ساتھ لے جاؤں گا۔“ (کامل ابن اثیر، مطالب الرسول، ارجح المطالب)

امیر المؤمنین کا یہ جواب بظاہر ناقابل قبول معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ جو شخص یہ کہہ رہا ہو کہ یا فتح یا شہادت اس کے لیے یہ کیا دشوار تھا کہ ان حضرات کی شہادت کے لیے کہہ دے کہ میں تو یہ کہہ ہی رہا ہوں کہ یا فتح یا شہادت آپ بھی شہید ہو جاتے یہ حضرت بھی ہو جاتے لیکن سائل کا سکوت بتلاتا ہے کہ سائل نے اس جواب کو تسلی بخش پایا اس سے اصل مقصود معلوم ہو گیا۔ مطلب یہ تھا کہ تم نے دو صورتیں بیان کیں، یا فتح یا شہادت تو فتح کی تو ان محدودے چند اطاعت شعاروں کے ساتھ جنگ کرنے میں کوئی اُمید ہی نہ تھی۔ دنیا دار الاسباب ہے۔ اس طرف کے اگر لاکھ نہیں تو ہزاروں کے مقابلہ میں ادھر کے چند مارے ہی جاتے۔ چنانچہ حسن و حسین، عبداللہ و محمد سب مارے جاتے لیکن ان کا مارا جانا گوارا نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ وقت ایسا ہے کہ ان کا بچانا زیادہ اہم ہے اور وہ بھی اس حد تک کہ آئندہ اس خطہ سے محفوظ رہنے کے لیے ان لوگوں کو کسی جنگ میں ساتھ لے جانے سے احتیاط کا ارادہ ہے۔ کہنے والا اب بھی کہہ سکتا ہے کہ یہ کیا بات ہوئی نسل رسول قطع ہو جاتی، ہو جاتی۔ یا کم از کم عبداللہ اور محمد خنیفہ کے لیے تو آپ نے قطع نسل کی توجیہ بھی نہیں کی۔ وہ مارے جاتے ہیں تو مارے جانے دیجئے۔ مگر سائل نے اس کا موقع نہ پایا۔ حالات پیش نظر تھے وہ جان رہا تھا کہ نسل رسول کے منقطع ہونے میں کیا خرابی ہے اور عبداللہ و محمد کے شہید ہونے سے کیا بگڑتا ہے، اُسے معلوم تھا۔ اور واقعہ بھی یہی تھا کہ نسل رسول کا انقطاع یا عبداللہ و محمد کے سے حضرات کی شہادت کا مطلب اُس دین کا فنا ہو جانا ہے جس کی حفاظت کے لیے علی جنگ کر رہے ہیں، کیونکہ دین حقیقی رسول صرف

نسلِ رسولؐ اور اُن کے معدودے چند مخلصین کے ساتھ وابستہ ہے نہ دینِ رسولؐ اُن سے جدا ہو سکتا ہے نہ وہ دین سے جدا ہو سکتے ہیں (انھما لن یفترقا حتی یردّا علی الحوض) تو ان کے قتل کے یہ معنی ہوتے کہ رسولؐ کی ساری محنت پر پانی پھر جاتا۔ گونظا ہر میں تو یہ کہہ کر خوش ہو جاتے کہ علیؑ نے بڑی بہادری کی جان دے دی۔ لیکن دورِ بین اور حقیقت شناس آنکھیں صرف دنیا کی تعریفوں پر نہیں لگاتیں، اس طرح رسولؐ کا مشن فیل ہو جاتا اور صرف وہی دین بلا کسی روک ٹوک اور کسی مقابل کے باقی رہ جاتا جو معاویہ اور اس کے ہم نگوں کے پاس تھا۔ لیکن علیؑ کو یہ کب گوارا ہو سکتا تھا کہ صرف ظاہر بین انسانوں کی تعریف کے لیے اس دین کو ڈبو دیتے جسے اپنے بچپن سے خون پسینہ ایک کر کے محفوظ رکھا تھا اور رسولؐ خدا جس کا امین آپ کو بنا کر دنیا سے تشریف لے گئے تھے۔

خلاصہ یہ کہ اصل میں اس اصول، اس مشن اور اس دین کی حفاظت عزیز تھی جو خاتم النبیین لے کر آئے تھے اور جس کے محافظ اہلبیت اور صرف اہلبیت تھے، اور جس کی بقا کے لیے امیر المومنینؑ جنگ کر رہے تھے یہ مقصود ہرگز نہ تھا کہ ملک فتح ہوتا یا شہادت کا تمغہ ملتا۔ شہادت بھی تو اسی لیے قابلِ قدر ہے کہ وہ دین حق کے بقا کا سبب ہے جو اصل مقصود ہے۔ اور جب اصل مقصود ہی مفقود ہوگا تو ایسی شہادت کس کام کی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جب عوام کی آنکھوں پر آنا گہرا پردہ پڑ چکا کہ عمار کے قتل کا سبب معاویہ علیؑ کو قرار دیتا ہے اور مدعیانِ اسلام اس کے جواب سے راضی ہو جاتے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ اس طرح کی شہادت میں حسن، حسین، محمد حنفیہ کا قاتل علیؑ کو قرار دے دیا جائے۔ ممکن ہے بہانہ خون عثمان کی طرح جب زمانہ

اندھا ہی ہو گیا ہے خونِ فرزندِ رسولؐ کا بہا نہ نکال دیا جائے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ظاہر کرنا تھا کہ فرزندِ انِ رسولؐ کس کے ہم رائے تھے اور جن کے لیے سرورِ عالم کی متوازدہ شہین شاہدِ فضل ہیں وہ کس کے پیرو اور ان کی حفاظت کس کے ذمہ ہے، وغیرہ۔

چونکہ اس کتاب کے اس حصہ میں مخاطب صرف شیعوں سے ہے اس بنا پر رسولِ خداؐ اور امیر المومنینؑ کے حالات کو تمہیداً پیش کیا گیا۔ امیر المومنینؑ کے یہاں تک کے حالات کے بعد امامِ حسنؑ کا سابقہ ایسی اُمت ایسی رعیت اور اسی دشمن سے ہوتا ہے جس سے ابھی ابھی کل برسوں تک علیؑ کو سابقہ پڑا تھا، امامِ حسنؑ ایسے لوگوں سے کیا توقع کر سکتے تھے یا امامِ حسنؑ کے ساتھ ان لوگوں کو کیا ہمدردی ہو سکتی تھی خود بخود واضح ہے لیکن قبل اس کے کہ ہم امامِ حسنؑ کی معاویہ سے صلح کا حال لکھنا شروع کریں مناسب خیال کرتے ہیں کہ امیر المومنینؑ اور معاویہ کے متعلق بعض مورخین کی رائیں نقل کریں تاکہ آئندہ رائے قائم کرنے میں سہولت ہو اور اندازہ ہو سکے کہ علیؑ کو ایسی دشواریاں تھیں تو علیؑ کے نقشِ قدم پر چلنے والے کو کیا دشواریاں ہوں گی درانحالیکہ حسنؑ کی بیعت بھی اُس طرح اور ان لوگوں نے نہ کی تھی جس طرح اور جن لوگوں نے علیؑ کی بیعت کی تھی۔ نیز حسنؑ سے عداوت میں اور بھی اضافہ ہو چکا تھا کیونکہ جمل و صفین اور نہروان کے مقتولین کے در ذہ اپنے مورثین کے قاتل (علیؑ) کے فرزند سے بدلہ لینا یا ان کی مخالفت کرنا یا کم از کم ان کی موافقت نہ کرنا اپنی میراث ہی جلتے تھے۔ اِلَّا مَا شَاءَ اللّٰهُ

صلحِ صفین کے متعلق احسان اللہ صاحب عباسی کی رائے

امیر المومنینؑ کے متعلق احسان اللہ صاحب عباسی اپنی تاریخِ اسلام میں جو رائے

لکھتے ہیں وہ بعینہ نقل کی جاتی ہے اور محبانِ علیؑ سے امید ہے کہ باوجود ادعا محبت واقعات سے بے بہرہ رہ کر امیر المومنینؑ کے خلاف رائے قائم کرنے میں تعجیل سے کام نہ لیں گے۔ اس لیے کہ وہ تو علیؑ کو معصوم اور خطاؤں سے پاک سمجھتے ہیں اور یہ رائے ایسے شخص کی ہے جو علیؑ کو غلطی کر سکنے والا انسان خیال کرتا ہے، (اس کی تائید تاریخ اسلام مولفہ عباسی صاحب میں ملتی ہے) احسان اللہ صاحب لکھتے ہیں :

”معاویہ کے ساتھیوں کو ہلکے کرنے، جھوٹ بولنے اور مسلمانوں کا خون ناحق بہانے میں کوئی تامل نہ تھا اور یہاں علیؑ بن ابی طالبؑ کو بڑی دقت یہ تھی کہ وہ خود کو احکام شرعی کا پابند رکھتے تھے۔ شروع میں وہ تلوار سے کام نہ لیتے تھے۔ تلوار جب اٹھاتے تھے کہ معاملہ اختیار سے باہر ہو جاتا تھا اور اس پر بھی ایک دقت یہ تھی کہ ان کے ساتھی بھی کبھی کبھی مسلمانوں کے مقابلہ میں تلوار اٹھانے سے رُک جاتے تھے اور ممکن ہے کہ معاویہ کے گروہ میں بھی ایسے لوگ ہوں جو حضرت عثمان کے قتل ناحق سے متاثر ہو کر نیک نتیجے سے شیعانِ علیؑ کے مخالف بنے ہوں۔ غرض کہ علیؑ کی حالت اپنی خلافت کے زمانہ میں عجب کشمکش میں تھی اور میرے نزدیک رسول اللہ کے صحابیوں سے کسی نے بھی حضرت علیؑ کی سی روحانی تکلیف نہیں اٹھائی۔ لوگ حضرت امام حسینؑ کی شہادت کے واقعہ کو نہایت سخت سمجھتے ہیں لیکن میرے نزدیک حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کی حالت کشمکش زیادہ تر ہمدردی کے لائق ہیں۔ اگر واقعہ کربلا کو طاعون سے نسبت دیں تو علیؑ کے دقتوں کو عارضہ رضیقِ نفس

سے تشبیہ دے سکتے ہیں (ص ۱۹۸) مطبوعہ ۱۸۹۵ء۔ بعض کج رائے مورخوں کا بیان ہے کہ حضرت علیؑ کی خود رائی ناکامی کا سبب ہوئی، لیکن حضرت علیؑ پر خود رائی کا الزام غلط ہے۔ علم، شجاعت، متانت اور حکمت ان کے حصہ میں تھی خود رائی چر معنی دارد، خود رائی نہیں بلکہ وہ حالات ان کی ناکامیوں کے سبب ہوئے جن کا خلاصہ اوپر بیان کیا گیا۔“

محاضرات راغب اصفہانی میں ہے کہ:

”معاویہ کو حضرت علیؑ پر محض اس وجہ سے غلبہ حاصل ہو گیا کہ معاویہ ہر حیلہ سے اپنا کام نکالتے تھے، چاہے حلال ہو یا حرام۔ بات یہ ہے کہ معاویہ کو دین کی پروا نہ تھی اور نہ خدا کا خوف تھا اور حضرت علیؑ کسی حیلہ ناجائز کو بھی کام میں نہ لائے۔“

علامہ ابن عبد البر استیعاب میں لکھتے ہیں:

”ابو قیس ازدی سے مروی ہے کہ میں نے لوگوں کو تین طرح کا پایا۔ ایک اہل دین جو حضرت علیؑ کو دوست رکھتے تھے۔ دوسرے اہل دنیا جو معاویہ کو چاہتے تھے۔ تیسرے خوارج۔“

رائٹ آنریبل سید امیر علی صاحب مرحوم بالقاب اپنی تاریخ (۹) A Short

History of the Saracens۔ (اے شارٹ ہسٹری آف دی سرنس) کے ص ۱۷ پر لکھتے ہیں:

”معاویہ کے چال چلن اور ان کیفیات کا خلاصہ جنھوں نے معاویہ کی جیت کو یقینی بنا دیا۔ ایک انگریز اہل قلم نے جس کے خیالات کم از کم

اس معاملہ میں تعصب کے نہیں ہو سکتے اس طرح بیان کیے ہیں: سیانا، بدنیت، اور بے رحم اموی خلفاء میں کا یہ پہلا خلیفہ کسی گناہ سے جو اس کے مطلب حاصل کرنے میں ضروری ہو نہ جھجکتا تھا اپنے ایسے مخالف کو جس سے اس کو خطرہ ہو راہ صاف کرنے کے لیے اس کو قتل کر دینا اس کی عادت تھی۔ پیغمبر کے نواسہ کو اُس نے زہر دلوادیا۔ علیؑ کے بہادر لفٹیننٹ مالک اشتر کو اسی طرح ہلاک کر دیا گیا۔ اپنے بیٹے یزید کی خلافت جمانے کے لیے معاویہ نے ان دعووں کی خلافت و رزی میں ذرا تاثر نہ کیا جن کا عہد علیؑ کے فرزند حسنؑ سے جو علیؑ کے بعد چ رہے تھے کر چکا تھا۔“

باوجود اس کے اس مطمئن پہلے سے تدبیر سوچ رکھنے والے، منکر خدا عرب نے اسلامی مملکت پر خود بھی حکومت کی اور اس کے خاندان کے قبضہ میں حکومت اسلامی کا عصا تقریباً نوے سال رہا۔

امام حسن علیہ السلام کو امیر المومنین علیہ السلام کے بعد انہی معاویہ صاحب سے سابقہ پڑا تھا بلکہ اتنا اور اضا ف تھا کہ ہر ہر شخص کو یہ معلوم تھا کہ امام حسنؑ ہو بہو علیؑ اور رسولؐ کی نقل ہیں اور انہی کے نقش قدم پر چلیں گے معاویہ کی طاقت اور علانیہ اسلام کشی کی جرأت میں اب ابتدائے بیعت امیر المومنین کے زمانے سے کہیں زیادہ اضافہ ہو چکا تھا اور ان لوگوں کی تعداد بھی بہت زیادہ ہو چکی تھی جو کھلم کھلا معاویہ اور اس کے اعمال کے طرفدار تھے اور معاویہ کی صحابیت و اجتہاد کی عظمت پورے شباب پر ہو گئی تھی امیر المومنین سے بڑھ کر نبی اللہؐ کہا گیا اور کسی مسلمان کو جرأت نہ تھی کہ ٹوکتا، دیکھو کامل ابن اثیر ج ۴ ص ۴۴، مالِ مُفْتَدِ دِلِ بے رحم داد و دوش

کا بازار اب زیادہ گرم تھا۔ خزانہ، فوج قبضہ میں تھی۔ پھر یہ امر بھی قابلِ لحاظ ہے کہ قتل عثمان کے بعد جیسا اضطراب و انتشار پھیلا تھا اور جس نے علیؑ کی بیعت پر لوگوں کو مجبور کر دیا تھا اور ایسے ایسے لوگوں کو بھی مجبور کر دیا تھا جو اپنے دل میں تمنائے حکومت و خلافت لیے ہوئے تھے، امام حسنؑ کے وقت میں نہ تو لوگوں میں ویسا اضطراب تھا اور نہ اس طرح کی بیعت ہی ہوئی تھی۔ بلکہ مورخین کا وہ بیان جو اوپر گزرا، بتلاتا ہے کہ آپ امیر المؤمنینؑ کی وصیت سے خلیفہ ہوئے۔ طبری و خلدون نے تو اس کو بھی صرف اشاروں میں بیان کیا۔ ان سب کا خلاصہ یہ نکلا کہ خلافت کے لیے جس بیعت کے لوگ اور جس رنگ کی بیعت کے لوگ عادی ہو چکے تھے وہ بھی مختلف ہے۔

اب ایک طرف تو معاویہ اور ویسا جیسا اوپر بیان ہوا۔ دوسری طرف وہ رعایا اور فوج جو آپ کی رعایا اور فوج کہلاتی تھی یعنی بہ الفاظ دیگر وہ لوگ جنہوں نے کلمہ کلمۃ معاویہ کو خلیفہ نہیں مانا تھا اور امام حسنؑ کی رعیت اس لیے تھے کہ وہ علیؑ کی فوج کے ایسے لوگ تھے جن کا ذکر ابھی ہوا، اور اس طرف امام حسنؑ جو حرف بحرف پابند احکام خدا و رسولؐ اور پابند شریعت اور پیرو رسولؐ و علیؑ۔

اس طرح امام حسنؑ کی حکومت یا بیعت ہوئی اور جس طرح کے لوگوں نے بیعت کی اس کا اندازہ اور ان بیعت کنندگان کو لے کر جس سے مقابلہ ہے اس کا بیان اوپر گزرا۔ اب ہم چاہتے ہیں کہ امام حسنؑ کے حالات پر نظر ڈالیں اور آپ کی صلح پر غور کریں کہ آپ کو رسولؐ کے دین کی ذمہ داری لیے ہوئے کیا کرنا چاہیے تھا۔ آپ ۱۵ رمضان ۳۵ھ بمقام مدینہ منورہ پیدا ہوئے۔ رسالت مآبؐ کی

شہادت کے وقت آپ کا سن کچھ اوپر سات سال کا تھا۔ آپ کی حیثیت و حالت عام بچوں کی سی نہ تھی بلکہ بچپن ہی سے خدا و رسولؐ کی طرف سے خاص امتیاز کے مالک تھے۔ آیت تطہیر کے مصداق واقعہ مابعد کا ایک جز، باوجود کسن ہونے کے اذاعتوں نامنوا کے مخاطب کسی بچہ سے بیعت نہ لینے کے باوجود رسولؐ خدا کا آپ سے بیعت لینا اور آپ کو مخاطب فرمانا وغیرہ بتلاتا ہے کہ آپ کی حیثیت عام بچوں کی سی نہ تھی۔

”ان الحسن بن علی جاء لابن بکر وهو على منبر رسول الله  
صلى الله عليه وآله وسلم قال انزل عن مجلس ابى فقال صدقت  
والله انه لمجلس ابى ثم اخذها واجلسه فى حجره وبكى“

(اربع المطالب ص ۲۷۱)

وہ تمام واقعات جو آپ کے نانا کی وفات کے ساتھ ہی اہلبیت پر آن پڑے سب آپ کے سامنے تھے۔ آپ نے اپنے نانا کی زندگی ہی میں آئندہ واقعات کی بہت کچھ خبریں سن لی تھیں اور بہت سے احکام سمجھے اور معلوم کر لیے تھے۔ امیر المؤمنین علیہ السلام کی زندگی کے وہ واقعات جو بعد وفات سرورِ دو جہاں پیش آئے تھے از اول تا آخر سب آپ کے پیش نظر تھے۔ اگر امام حسن علیہ السلام کی حالت صرف عام انسانوں کی سی بھی مانی جائے، خاندانی خصوصیات، امامت، عصمت وغیرہ کا لحاظ نہ بھی کیا جائے تب

لے جب میں دعا کروں تم آمین کہنا۔

۱۷ امام حسن، حضرت ابو بکر جس وقت منبر پر تھے بچہ پوچھے فرمایا میرے باپ کی نشست گاہ سے نیچے آؤ۔ ابو بکر نے کہا، سچ کہا، بخدا یہ آپ ہی کے باپ کی جگہ ہے، پھر آپ کو گود میں بٹھایا اور رو دیئے۔

بھی حضرت ابو بکر کی خلافت کا زمانہ آپ کے سات سے نو برس تک کے سن کا ہے، ایسے حوادث اس سن کے بچے اچھی طرح یاد رکھتے ہیں اور رکھ سکتے ہیں۔ پھر عرصہ صاحب کی خلافت تو سن شعور و شباب میں دیکھی۔ حضرت عثمان کی پوری خلافت بھی پورے تجربہ و عملی زندگی کے زمانہ میں گزری۔ آپ نے عالم کارنگ ڈھنگ، امیر المؤمنین کی بیعت ظاہری اور اس کے آثار خوب اچھی طرح دیکھے اور امن انقلاب، جنگ، صلح کے نقشے پوری طرح آپ کے سامنے رہے۔ مدعیان اسلام کے کیریکٹر بھی واضح طور سے پیش نظر رہے۔ اگر آپ کی ۱۸ برس کی عمر سے امیر المؤمنین کی بیعت عامہ کے زمانہ تک اور آپ کے عہد حکومت تک کا حساب لگایا جائے تو آپ کو مکمل ۲۵ سال اس امر میں گذرے کہ آپ مسلمانوں کے حالات نہایت ہی اتصال کے ساتھ ملاحظہ فرماتے رہے اور اصحاب کا رجحان طبعی اور بیعت کرنے والوں کے میلان فطری کا گہری نظر سے مطالعہ فرماتے رہے۔ امیر المؤمنین علیہ السلام کی شہادت ۲۱ رمضان ۴۰ھ میں واقع ہوئی اس وقت امام حسن کی عمر ۳ سال کی تھی اور آپ کی بیعت انھیں مدعیان اسلام نے کی تھی جنھوں نے امیر المؤمنین کی بیعت کی تھی اور جو مقام خیلہ سے باوجود سخت تنبیہ، ترغیب، توجیح، و تحریص کے معاویہ سے جنگ پر آمادہ نہ ہو کر متفرق ہو گئے تھے۔ اب حالات مذکورہ بالا پر نظر کرتے ہوئے دیکھنا ہے کہ امام حسن علیہ السلام کی حکمت عملی کیا ہونا چاہیے تھی۔ آج تو کوتاہ بین کہہ رہے ہیں کہ امام حسن نے صلح کی نہ کرنا چاہیے تھا۔ اگر کہیں آپ نے فوج کشی بھی نہ کی ہوتی تو نہ جانے دینا اور کس گمراہ کن رلے پر جم جاتی۔ غالباً اسی دن کے لیے آپ نے باوجود اس کے کہ ان بیعت کرنے

والوں کی خوباؤں سے اچھی طرح واقف تھے پھر بھی نادانوں کی زبان بند کرنے اور کوتاہ اندیشیوں پر رجحیت تمام کرنے کی خاطر جنگ کا ارادہ کر لیا اور ظاہری کوئی کمی نہ چھوڑی آپ کی بیعت ہوتے ہی معاویہ نے ۹۰ ہزار فوج لے کر آپ پر حملہ کیا اور مقام مکن میں آپ کو تراجو بغداد سے دس فرسخ تکریت کی جانب اوانا کے قریب واقع ہے۔

امام حسن علیہ السلام نے بھی مقابلہ کے لیے خود فوج کی کمان ہاتھ میں لی اور قیس بن سعد بن عبادہ رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ بارہ ہزار فوج بھیجی جو معاویہ کی پیش قدمی کو روکنے اور خود فوج لے کر کوفہ سے سا باط مدائن میں آگئے لیکن چند روز بعد مدائن میں ایک جھوٹی خبر مشہور ہو گئی کہ قیس مارے گئے تاریخ کامل و تاریخ بن واضح سے واضح ہوتا ہے کہ یہ خبر معاویہ نے مشہور کرائی تھی۔ اس خبر سے امام حسن کی فوج میں بناوت پھیل گئی، وہی لوگ جو آپ کے ساتھ ہو کر معاویہ کا مقابلہ کرنے کا اظہار کر رہے تھے آپ کے خیمہ پر ٹوٹ پڑے، آپ کا سب مال و متاع لوٹ لیا، آپ کے نیچے سے مصلیٰ تک گھسیٹ لے گئے اور ردائیک دوش مبارک سے اُتار لی۔ مگر ربیعہ اور ہمدان کے بعض بہادروں نے آپ کو بچالیا اور بعض گمراہوں نے معاویہ سے سازش کر کے اور دشواری لے کر ارادہ کر لیا کہ آپ کو گرفتار کر کے معاویہ کے حوالہ کر دیں، اور ان کے بعض رئیسوں نے خفیہ خط و کتابت کر کے معاویہ کی اطاعت قبول کر لی اور اُسے لکھا کہ بہت جلد عراق چلے آئیے۔ ہم ذمہ لیتے ہیں کہ امام حسن کو چکڑا کر آپ کے حوالہ کر دیں گے (حبیب السیر و ابن اثیر)۔ اس ہنگامہ میں آپ کی ران پر ایک بد بخت نے ایسا وار بھی کیا کہ جس سے ہڈی تک کا گہرا زخم لگا۔ مجبوراً وہاں سے مدائن کے قصر امیض میں چلے گئے اور اس کے علاج میں مصروف ہوئے۔

اوپر بیان ہو چکا ہے کہ امام حسن کی بیعت کرنے والے یا آپ کی فوج زیادہ سے زیادہ چالیس ہزار تھی، اور معاویہ جو فوج میدان میں لایا وہ نوے ہزار تھی۔ قرآن مجید کی آیت میں جہاد کے لیے دو کے مقابلہ میں ایک کی حد رکھی گئی ہے اس حساب سے ۸۰ ہزار ہوتے تو ۴۰ ہزار سے لے کر جنگ کی گنجائش ہوتی، ورنہ بحکم قرآن و جہاد سے آزادی ہے۔ یہ تو جب ہوتا جب کوئی امام کی سنت بھی مگر یہاں کا عالم تو وہ تھا کہ جس کے متعلق معلوم ہو کہ ان لوگوں کو ابھی ابھی امیر المومنین نے ہر چند ابھارا، اگسایا، ملامت کی، رغبت دلائی مگر وہ معاویہ سے لڑنے پر آمادہ نہ ہونا تھا نہ ہوئے۔ عباسی صاحب تاریخ اسلام ص ۲۰۸ پر لکھتے ہیں جنگ خوارج کے بعد:

”اب امیر المومنین نے براہ موصل شام چلنے کا ارادہ کیا۔ لیکن سرداران فوج کی رائے ہوئی کہ ہتھیار خراب ہو گئے ہیں۔ کوفہ چل کر نئے ہتھیار لیے جائیں اور پھر وہاں سے شام کا ارادہ کیا جائے۔ کوفہ میں چل کر سپاہیوں نے ہاتھ پاؤں پھیلا دیے جس سے علیؑ نے ارادہ ملتوی کر دیا۔ پھر لوگوں نے امیر المومنین علیؑ سے معذرت کی اور انھوں نے بہ مجبوری معذرت قبول کی، معذرت قبول نہ کرتے تو اور کیا کرتے“

یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ معاویہ کے یہاں کسی اصول اسلامی کی پابندی نہ تھی بلکہ جس طرح ہو سکے حصول مقصد پیش نظر تھا۔ مگر امیر المومنین کے یہاں سرمواہکام شرع سے تجاوز جائز نہ تھا۔ نہ خود تجاوز کرتے نہ تجاوز کرنے والے سے چشم پوشی

کو جائز رکھتے۔ علامہ عباسی ص ۹۷ پر لکھتے ہیں:

”پیغمبر خدا کو مرے ہوئے پچیس برس ہو چکے تھے۔ ان کے فیضِ صحبت کا اثر طبیعتوں سے زائل ہو چلا تھا۔ جنگِ جمل تک کھینچ کھاچ کر نیک نیتی اور غلط فہمی کو کھپایا گیا لیکن اب اس کی گنجائش نہیں رہی۔ اب صاف طور پر تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ امیر المؤمنین علی کرم اللہ وجہہ نیک نیتی کے قدمِ بقدم تھے، یعنی دین اور دنیا دونوں کو وہ ساتھ رکھنا چاہتے تھے۔ وہ یہ گوارا نہیں کر سکتے تھے کہ امتِ نبوی پر کوئی نااہل حکمراں یا امیر ہو، اور یہ بھی پسند نہیں کرتے تھے کہ جس کو وہ سب سے اچھا سمجھیں (یعنی اپنی ذات کی اُسے پولیٹیکل معاملات سے الگ رکھیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ دین کو دنیا پر مقدم سمجھتے تھے۔ مسلمانوں کے مقابلہ میں وہ تلوار بھی اٹھاتے تو اس لیے کہ بغاوت کا رفع کرنا اور ناسزاؤں کو سزا دینا ضروریات سے تھا یہ بھلا ہو یا بُرا۔ بس اس کے سوا اور کوئی فعل وہ ایسا نہ کرتے تھے جو کسی فریق کے نزدیک مذہب کے خلاف یا اخلاقی خوبیوں کے منافی ہوتا۔ مسلمانوں کا دوسرا گروہ ان لوگوں کا مجموعہ تھا جو دنیاوی لذتوں کو مقدم سمجھتے تھے اور دنیا زور نہ لانا حاصل الا بالزور پر عمل کرنے میں تامل نہ کرتے تھے۔ یہ گروہ

لے یہ عباسی صاحب کی رائے ہے درزہم تو صحبت کے فیض سے محرومی کا نقشہ رسول کے عالمِ احتضار میں دیکھ رہے ہیں۔

۱۔ بلکہ دین کو ہر وقت ملحوظ اور مقدم رکھنا چاہتے ہیں۔  
۲۔ دنیا سزا پا کر ہے جو بغیر مکاری ہاتھ نہیں لگتی۔

دیجھا دیکھی بڑھتا گیا اور سنت نبوی سے الگ ہو کر شام اور عجم کے سلاطین اور ان کے اراکین کا رنگ پکڑتا گیا۔ معاویہ اس گروہ کا سردار تھا۔ اتفاقاً زمانہ نے اس کو سردار بنا دیا، یا یوں کہیے کہ اس کے ذریعہ سے لوگوں کو اپنے مافی الضمیر کے اظہار کا موقع ملا۔“

امیر المؤمنینؑ کی شرعی پابندی کی حد اس درجہ بلند تھی کہ بقول شخصے حضرت ابن عباس اور عقیل بن ابی طالب جیسے لوگ بھی برداشت نہ کر سکے اور آپ کا ساتھ دے سکے۔ امام حسنؑ کی پالیسی بلکہ جیسا کہ بار بار کہا جا چکا ہے کل اہلبیتؑ کی پالیسی ایک اور صرف ایک تھی۔ د ملاحظہ ہو در اساتۃ اللیبب ص ۴۹، طبع لاہور ۱۳۴۸ھ وہ یہ کہ حکم خدا اور حکم رسولؐ کی پابندی انھیں کے احکام کا اجرا چاہے اس مطلب کے لیے جو برداشت کرنا پڑے۔ مذکورہ بالا حالات میں امام حسن علیہ السلام کے لیے سوائے صلح کیا چارہ ہو سکتا تھا اس کو خود صاحبان عقل سمجھ سکتے ہیں کسی استدلال کی چنداں ضرورت نہیں۔ یہاں پر علامہ ابن اثیر کی یہ عبارت جو اپنی تاریخ کامل میں لکھتے ہیں قابل غور ہے:

”کہا گیا ہے کہ امام حسنؑ نے حکومت معاویہ کو اس لیے سپرد کی کہ جب معاویہ نے خلافت حوالہ کرنے کے متعلق آپ کو خط لکھا اس وقت آپ نے خطبہ پڑھا اور خدا کی حمد و ثنا کے بعد فرمایا کہ دیکھو ہم کو شام والوں سے اس لیے نہیں دینا پڑ رہا ہے کہ (اپنی حقیقت میں) ہم کو کوئی شک یا ندامت ہے بات تو فقط یہ ہے کہ ہم اہل شام سے سلامت و صبر کے ساتھ لڑ رہے تھے۔ مگر اب سلامت میں عداوت اور صبر میں فریاد مخلوط کر دی گئی جب تم لوگ صفین کو جا رہے تھے اس وقت تمہارا دین تمہاری دنیا پر مقدم تھا لیکن اب تم ایسے

ہو گئے ہو کہ آج تمہاری دنیا تمہارے دین پر مقدم ہو گئی ہے۔ اس وقت تمہارے دونوں طرف دو قسم کے مقتول ہیں، ایک صفین کے مقتولین جن پر رو رہے ہو، دوسرے نہروان کے مقتول جن کے خون کا بدلہ چاہ رہے ہو۔ خلاصہ یہ کہ جو باقی ہے وہ ساتھ پھوڑنے والا ہے، اور جو رو رہا ہے وہ تو بدلہ لینا چاہتا ہی ہے۔ خوب سمجھ لو کہ معاویہ نے ہم کو جس امر کی دعوت دی ہے نہ اس میں عزت ہے نہ انصاف۔ لہذا اگر تم لوگ موت پر آمادہ ہو تو ہم اس کی دعوت کو رد کر دیں اور ہمارا اس کا فیصلہ خدا کے نزدیک بھی تلوار کی باڑھ سے ہو جائے اور اگر تم زندگی چاہتے ہو تو جو اُس نے لکھا ہے مان لیا جائے اور جو تمہاری مرضی ہے دیا ہو جائے۔ یہ سُننا تھا کہ ہر طرف سے لوگوں نے جَلاناً شروع کیا، بقا، بقاء، صلح، صلح۔“

(کامل ابن اثیر ج ۳ ص ۱۶۲)

ناظرین انصاف فرمائیں کہ کیا اب بھی امام حسن علیہ السلام کے لیے یہ رائے ہے کہ صلح نہ کریں، ان فوجیوں کے بل بوتے پر اگر ایسوں کو فوج یا ان کی قوتوں کو بل بوتے پر کہا جاسکے، لڑائی زیادہ ہے، ہرگز نہیں!۔ ایسے حالات میں صرف یہی چارہ تھا کہ صلح کر کے اپنی اور ان تمام لوگوں کی زندگی کو محفوظ رکھیں جو دین رسول کے نام لیوا اور حقیقی پیرو پابند تھے جن کو حفظ اصول نہایت درجہ عزیز تھا اور جن کی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی تھی بجائے اس کے کہ ان نام نہاد بیعت کرنے والوں کے ہاتھوں گرفتار ہو کر معاویہ کے قیدی بن کر قتل ہو جائیں اور اس طرح وہ تعلیم اور دین جس کے علمبردار اہلیت تھے ان شہداء سمیت دفن ہو جائے یا صلح سے کام لیں اور اپنے اور خالص

ایمان داروں کے لیے میدان صاف کر لیں۔ روحانی اذیتیں برداشت کریں، سخت سے سخت اہانت آمیز فقرے، جملے سنیں، خون دل پیئیں اور اس لیے زندہ رہیں کہ دین رسولؐ جو معاویہ و طرف داران معاویہ کے یہاں ذبح کیا جا رہا تھا زندہ بچ جائے اور شائع ہو جائے کہ اصل تعلیم و دین رسولؐ کیا ہے اور فریب معاویہ کا پردہ چاک ہو جائے۔ غیر جانب دار تو غیر جانب دار خود معاویہ اور اس کے ہمنواؤں پر بھی روشن ہو جائے (چاہے وہ خود غرض زبان سے اقرار نہ بھی کریں) کہ پیغمبر اسلامؐ کیلے کر آئے تھے اور وہ کس قول و عمل کے خواہاں تھے اور اس تعلیم کا حافظہ، محافظ عالم اور عامل کون اور کدھر ہے اور اس کا مخالف کون اور کدھر ہے۔ زمانہ صلح اتنا رکھ لیا جائے کہ اس آواز کو اتنی دور تک اور اس انداز سے محکم کر لیا جائے کہ آئندہ اگر معاویہ سے بڑھ چڑھ کر بھی کوئی اسلام کو فنا کرنے کے لیے کھیل کھیلے اور علی الاعلان دین رسولؐ کو صفحہ ہستی سے مٹانے میں منہمک ہو جائے تب بھی اس کے بس سے یہ امر باہر رہ جائے اور اس کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکے۔ یوں ایمان خالص اور وہ تعلیم رسولؐ جس کے قائل و عامل اہلبیتؑ ہیں اس کے پابندوں کی ایسی تعداد پیدا ہو جائے جسے لے کر اگر کوئی صاحب ایمان، مخالفین کے سامنے کھڑا ہو جائے تو مرتے دم تک وہ اپنے واجب الاطاعت اور صاحب ایمان سردار کا ساتھ نہ چھوڑے بلکہ پروانہ وار خود جل مرے مگر اپنی زندگی تک اس شمع ایمان کو گل نہ ہونے دے۔

امام حسن علیہ السلام کے پیش نظر یہ مقصد برابر تھا کہ آنے والے ذبح عظیم کو کامیابی کے مواد دیے جائیں چاہے اس کے واسطے موت سے بدتر روحانی اذیتیں سہنا پڑیں۔ لیکن یہ مقصد امام حسنؑ کے اس طرح جان دے دینے میں جو معاویہ سے

صلح نہ کر کے ہوئی ہرگز حاصل نہ ہوتا۔ امیر المؤمنین کی شہادت کے بعد اور ان لوگوں کی ظاہراً بیعت کا مقتضی تھا کہ آپ بھی بیعت نہ کرنے والوں یا خلیفہ برحق سے جنگ اور مخالفت کرنے والوں پر فوج کشی کریں، وہ کی گئی۔ لیکن جو کچھ اس فوج نے کر دکھایا وہ ظاہر ہے جس کا بیان اوپر گذرا۔ اب امام حسن کے لیے دو ہی صورتیں ممکن نظر آتی ہیں یا صلح کرنا یا بے یار و مددگار جنگ کو جاری رکھنا، اور پھر جس صورت سے ہو جاں بحق ہو جانا۔ جن لوگوں نے امام حسین علیہ السلام کی شہادت اور امام حسن کی صلح کا صرف سرسری نظر سے مطالعہ کیا ہے وہ دھوکے میں ہیں۔ ادھر امام حسن اور امام حسین اُدھر ان کے دونوں مخالف معاویہ و یزید۔ پھر دونوں کے وقت اور حالات میں امتیاز بغیر فیصلہ کر دیتے ہیں کہ امام حسن کو بھی وہی کرنا چاہیے تھا جو امام حسین نے کیا۔ حالانکہ ایک شہزادہ نے اپنے وقت اور حالات میں جو کچھ کیا یقیناً دوسرا شہزادہ بھی وہی کرتا اگر اس کے وقت و حالات ویسے ہی ہوتے جیسے ایک کے تھے۔ اگر حسین کی فوج کے سرداروں میں اشعث ایسے لوگ ہوتے اور آپ کو بھی معاویہ جیسے شخص سے لڑنا پڑتا جو عمار کو قتل بھی کرتا پھر اس سے دامن کشی بھی جو حجر بن عدی کو قتل بھی کرتا، پھر نماز جنازہ و تجہیز و تکفین بھی تو امام حسین بھی ایسا ہی کرتے جو حسن نے کیا بلکہ امام حسین نے بمقابلہ معاویہ وہی کیا جو حسن نے کیا۔ (دیکھو واقعات صفحہ ۶ تا ۱۰) جب امام حسین زندہ تھے اور معاویہ کا دور تھا، اور اگر امام حسن کو بھی وہ انصاف ملتے جنھیں ہر طرح ساتھ چھوڑنے کا موقع دیا گیا۔ مگر انھوں نے حسین کے قدموں پر فدا ہونے کو دنیا و آخرت کی تمام لذتوں سے زیادہ لذیذ سمجھا۔ جب و سلم جیسے جاں نثار دستیاب ہو گئے ہوتے اور آپ کو بھی یزید سے لڑنا

پڑتا جو بیعت یا قتل کے سوا کسی دوسرے امر کو جائز نہ رکھتا جو مسلمان مقتولین کے دفن کی اجازت نہ دیتا جو،

لعبت هاشم بالملك فلا  
ملك جاء ولا وحى نزل<sup>۱</sup>

کا اعلانیہ قائل ہوتا تو امام حسن بھی وہی کرتے جو امام حسین علیہ السلام نے کیا۔  
اب ہم امام حسن کی صلح کے متعلق بعض اہلسنت کی کتابوں کی عبارتیں نقل کرتے ہیں، پھر انشاء اللہ نتیجہ پر بحث کریں گے۔

شیخ محمد صبان اپنی کتاب اسعاف الراغبین مطبوع مصر، حاشیہ نور الابصار ص ۴۷، مطبع دار احیاء الکتب العربیہ ۱۳۴۵ھ پر لکھتے ہیں:

”حسن بصری کی جو روایت بخاری میں ہے وہ یہ ہے کہ امام حسن نے معاویہ کے مقابلہ میں پہاڑ کی طرح فوج لاکھڑی کی۔ اس وقت عمرو عاص نے معاویہ سے کہا کہ میں ایسا لشکر دیکھ رہا ہوں جب تک اس کے سب سر گروہ قتل نہ ہو جائیں ہٹنے والی نہیں۔ تب معاویہ نے جو خدا کی قسم ان دونوں میں سے بہتر آدمی تھا کہا کہ اے عمرو! اگر ان لوگوں نے ان کو اور ان لوگوں نے ان کو قتل کر ڈالا تو پھر میں مسلمانوں کا انتظام رکن کے ذریعہ کروں گا، ان کے رشتہ داروں اور ان کے اموال کا نظم و نسق رکن سے کراؤں گا۔ یہ کہہ کر اس نے قریش کے قبیلہ بنی عبد شمس

لے آئی ہاشم (یعنی نبی کریم) نے ملک گیری کا کھیل کھیلا، نہ کوئی فرشتہ آیا نہ ان پر وحی ہوئی۔

کے دو آدمی یعنی عبدالرحمن بن سمرہ اور عبدالرحمن بن عامر کو امام حسن کے پاس بھیجا اور کہا کہ تم دونوں اس شخص (امام حسن) کے پاس جاؤ اور صلح پیش کرو۔ ان سے کہو سنا اور ان سے اس کی خواہش کرو۔ یہ دونوں آپ کے پاس آئے، باتیں کیں اور یہ کہا کہ معاویہ آپ کے سامنے یہ باتیں پیش کرتا ہے اور آپ سے یہ چاہتا ہے اور اس کا یہ سوال ہے۔ امام نے کہا کہ میرے پاس اس کا ضامن کون ہے؟۔ ان دونوں نے کہا کہ ہم اس کے ضامن ہیں۔ اب امام حسن ان دونوں سے جو جو مطالبہ کرتے گئے یہ دونوں اس کا ذمہ لیتے گئے۔ اس طرح امام حسن نے معاویہ سے صلح کی۔“

اس عبارت کے چند سطروں کے بعد لکھتے ہیں:

”دولابی نے روایت کی ہے کہ امام حسن (علیہ السلام) نے فرمایا کہ عرب کے سرہمارے قبضہ میں تھے (جب واقعی حق دار ہونے کے ساتھ ساتھ ظاہری بیعت اور خلیفہ مابین کی طرف سے تعین و تخصیص ہو چکی) جس سے ہم صلح کرتے ان کو صلح کرنا پڑتی اور جس سے ہم جنگ کرتے انہیں جنگ کرنا پڑتی لیکن ہم نے خدا کی مرضی کے لیے اور مسلمانوں کی جان بچانے کے لیے جنگ کو ترک کیا، اپنی حکومت ۳۰ ماہ ربیع الاول اور بقولے جمادی الاولیٰ میں ترک کی اس پر ان کے اصحاب ان سے یا عار المؤمنین کہہ کر خطاب کرتے، آپ ان کے جواب میں یہ فرماتے کہ العار خیر من دخول النار (جہنم میں جانے سے عار اختیار کرنا بہتر ہے) اس کے بعد آپ کوفہ سے مدینہ چلے گئے اور وہیں اقامت فرمائی۔ اس کے بعد یہ برابر ہوتا رہا کہ

وہاں کا حاکم امام حسنؑ اور ان کے والد (علیہما السلام) کو برسبر منبر اور دوسرے حالات میں بھی سب دشتم کرتا رہا، اور آپ کو ایسی ایذا دیتا رہا جس کی اذیت سے موت کی اذیت کم ہے۔ لیکن آپ نے محض خدا کی خوشنودی کے لیے صبر فرمایا اور چونکہ آپ نے حکومت (یا خلافت ظاہری) محض خدا کی خوشنودی کے لیے ترک کی۔ لہذا خداوند عالم نے آپ کو آپ کے اہلبیتؑ کو اس کے عوض میں خلافت باطنی عطا فرمائی۔ یہاں تک کہ ایک قوم تو اس کی قائل ہے کہ اہلبیتؑ کے سوا کبھی قطب الاولیاء کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔“

یہ دونوں عبارتیں یعنی ہوا عنق محرقہ ص ۸۱ مطبوعہ مہینہ مصر پر بھی موجود ہیں۔ ان دونوں عبارتوں سے امور ذیل واضح طور پر ثابت ہیں:

۱۔ صلح کی گفتگو کا پیغام امام حسنؑ کے پاس معاویہ نے بھیجا، امام حسنؑ نے ابدار نہیں فرمائی۔

۲۔ امام حسنؑ نے صلح قبول کرنے کے لیے دونوں آنے والے ایچپوس سے عہد و میثاق لیا۔

۳۔ صلح کے بعد جو اذیت آپ کو دی جاتی رہی اس سے موت کی اذیت کم تھی۔

۴۔ اذیت دینے والا امیر معاویہ کی طرف کا حاکم تھا، اور یہ واقعات خاص امام حسنؑ کے نانا رسول اللہؐ کے مدینہ میں اور ان لوگوں کے سامنے ہوتے تھے جو وہاں کے باشندے تھے۔

۵۔ شرائط صلح میں جیسا کہ ذکر ہو گا سب نہ کرنا بھی تھا، مگر اس کی کھلم کھلا مخالفت کی گئی۔

۶۔ جو لوگ امام حسن کے اصحاب کہلاتے تھے ان کو امام حسن کے فعل پر اتنا بھی اعتماد نہ تھا جتنا عام دوستوں کے فعل پر عام احباب کا ہوتا ہے ورنہ وہ عار المؤمنین نہ کہتے اور ان کو اتنی بھی محبت نہ تھی کہ کم از کم ان کے منہ پر ان کے فعل کی نکتہ نہ کرتے اور باوجود امام حسن کے سمجھانے کے اپنی اس حرکت کو برابر جاری رکھتے، اور دوسرے لوگ بھی اس کو نہ ٹوکتے اور باوجود فوج کی نالائقی بلکہ فوج کے اصرار پر صلح کی گئی پھر بھی عار المؤمنین کہا۔

۷۔ معاویہ نے بیان کیا کہ اتنے مسلمانوں کے منہ سے اس درجہ ابتری پھیلے گی کہ مسلمانوں کے امور ناموس اور جائیدادوں کی خبر گیری کرنے والے تک نہ رہیں گے۔

۸۔ شرائط صلح کی ایسی مخالفت کے باوجود بھی اکثر مسلمانوں نے معاویہ کا ساتھ نہ چھوڑا معاویہ سے جنگ کی نہ اس کو نااہل کہا۔

۹۔ امام حسن علیہ السلام جنگ کرنے کو (علی الخصوص محض لوگوں کے مرعومہ عار سے بچنے کے لیے)، اس وقت اس درجہ بدتر سمجھتے تھے کہ گویا جنگ کرنا خود کشی تھی (جس کی سزا میں نار کا وعدہ ہے)، ورنہ العار خیر من دخول النار کا کوئی مطلب نہیں۔ یہ تو شبہ بھی نہیں ہو سکتا کہ امام حسن معاویہ کو حق پر سمجھتے تھے اس لیے اس سے لڑنا معاذا اللہ نار کا سبب تھا اس لیے کہ امام حسن نے قبل و بعد وقت صلح معاویہ کا باطل پر ہونا خوب اچھی طرح واضح کر دیا تھا، ورنہ فوج کشی

چہ معنی وارد۔ اور دوسری طرف تمام اہل اسلام کا اجماع کہ امام حسنؑ بعد امیر المؤمنینؑ خواہ بہ بیعت خواہ بہ وصیت امام اور خلیفہ ہو چکے تھے۔

۱۰۔ امام حسنؑ اور معاویہ میں مصالحت ہوئی۔ اور صلح کرنے کا مطلب طرف مقابل کی ہمیشہ حقیقت تو ہو ہی نہیں سکتی، ورنہ رسولؐ کی صلح حدیبیہ پر معاذ اللہ حروف آتا ہے۔ بہر حال لفظ صلح قابل فراموشی نہیں ہو سکتی اگر امام برحق سمجھے کہ بیعت ہوتی تو عہود موثیق یہ کرنا ہو گا یہ نہ کرنا ہو گا وغیرہ۔ یعنی چہ خلاصہ یہ کہ یہ صلح تھی اس کو بیعت امامت سمجھنا غلط ہے۔

۱۱۔ صلح کی مصلحت جو امام حسنؑ نے ظاہر کی ہے وہ دیکھئے، خدا کی خوشنودی اور مسلمانوں کی جانوں کی حفاظت۔ گویا صلح نہ کرنا اس وقت ایسا تھا کہ ایک تو خدا ناراض ہوتا۔ دوسرے صرف آپ کا خون بہہ کر نہ رہ جاتا بلکہ مسلمین دکن کون اور کیسے کیسے یہ مجمل ہے، کا خون عبت بہتا جس کو بچانا اہم تھا۔

۱۲۔ امام حسنؑ کا یہ فعل خدا کو اتنا پسند ہوا کہ انعام میں قطب اولیا ہمیشہ کے لیے اہلبیتؑ میں سے معین ہو گیا، اور بقول علامہ ابن ابی الحدید مرتبہ ولایت مرتبہ خلافت سے کہیں بلند ہے۔ اس آخری نتیجہ سے اس کا اندازہ بھی ہو سکتا ہے کہ جو چیز معاویہ کے حوالہ تھی وہ کیا اور کس حیثیت کی تھی اور امام حسنؑ کے پاس اس چیز کے چلے جانے پر بھی جو چیز رہی اور آپ کے خاندان کی غلام بن کر رہی۔ وہ کیا۔ اور کتنی قیمتی تھی۔ اور وہ قابل نزار و تحویل ہو بھی سکتی تھی یا نہیں۔ یعنی باطنی ظلت اور قطب الاولیا کی منزلت۔

اسعاف الراغبین کی عبارت کے بعد اب ہم امام حسنؑ کی صلح اور مفصل شرائط

صلح کے لیے دوسری کتابوں کی طرف رجوع کرتے ہیں جو متفرق کتابوں میں متفرق طور پر ملتے ہیں ان کا خلاصہ حسب ذیل ہے :

۱۔ معاویہ مسلمانوں پر بموجب کتاب اللہ اور سیرت خلفاء صالحین کے حکومت کرے گا۔

۲۔ بیت المال کوفہ میں جو پچاس لاکھ درہم ہیں وہ امام حسن کو دیے جائیں تاکہ وہ اپنا قرضہ ادا کریں۔

۳۔ فساد اور دارالجد کا خراج امام حسن کو ملتا رہے گا کہ اہلبیت کے صرف میں آتا رہے۔

۴۔ اب سے حضرت علیؑ پر سب و شتم نہ کیا جائے گا۔

۵۔ معاویہ کو یہ اختیار نہ ہوگا کہ اپنا کوئی ولی عہد مقرر کرے بلکہ شوریٰ کے رو سے اس کے بعد مسلمانوں کا حاکم مقرر ہوگا اور بروایت اوکلی حیوۃ الحيوان طبریٰ ابن قتیبہ اور اعثم کوفی یہ شرط اس طرح تھی کہ معاویہ کے بعد امام حسن خلیفہ ہوں گے اور اگر ان کا انتقال ہو جائے تو امام حسینؑ۔

۶۔ زمین خدا پر شام، مصر، عراق، حجاز، یمن وغیرہ میں سب جگہ لوگ جان و مال سے امن و امان میں رہیں گے۔

۷۔ اصحاب علیؑ اور شیعان علیؑ کی جان و مال، عورتیں اور اولاد، سب مامون و محفوظ رہیں گے۔

۸۔ حسن بن علیؑ اور ان کے بھائی حسینؑ اور اہلبیتؑ میں سے کسی شخص کے حق میں کہیں خفیہ یا علانیہ معاویہ تعریض یا بدی نہیں کرے گا۔ سب محفوظ رہیں گے،

انہیں کسی طرح کا خوف نہیں دلایا جائے گا۔

۹۔ معاویہ اس عہد نامہ پر خدا سے عہد میثاق کرے اور اُسے پورا کرے۔  
(صواعق محرقہ و حبیب السیر، تاریخ اسلام ص ۲۷ جلد اول)

تاریخیں علی العموم اذان دے رہی ہیں کہ امام حسن کی فوج میں نفاق کا بازار گرم تھا۔ اوپر ذکر ہو چکا کہ فوج میں ایسے رشوت خور اور نمک حرام بھی تھے جو امام حسن کو پکڑ کر معاویہ کے حوالہ کر دینا چاہتے تھے، روضۃ الصفا ج ۳ ص ۳۸ میں بعضے از لشکریان کہ مذہب خوارج داشتند کی تصریح ہے۔ پھر ایسی فوج کو لے کر جنگ کرنا متقضائے دانشمندی ہے یا صلح کر لینا۔ (اور صلح بھی وہ جس میں مشن یعنی تعلیماتِ رسولؐ کی پوری پوری حد بندی اور استحفاظ کا انتظام کر لیا گیا ہو اور جانب مخالف کی بددیانتی اور کتاب و سنت کی خلاف ورزی کا راز بھی منکشف ہو رہا ہو) یہ امر کسی صاحبِ عقل سے تو پوشیدہ نہیں ہو سکتا۔ رہی زریٰ ضد تو اس کا جواب دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ جب ہم کسی عاقل کے لیے بے سمجھے بوجھے جان دینے کو اچھا نہیں کہہ سکتے ہیں تو امام حسن کے لیے کیسے تجویز کر سکتے ہیں۔ ابن خلدون کا ترجمہ جلد چہارم ص ۶۶ ملاحظہ ہو:

”شور و غل فرو ہونے کے بعد امام حسن نے لوگوں کی خورد رانی اور نفاق کی وجہ سے امیر معاویہ کو لکھ بھیجا کہ میں خلافت و حکومت سے دست کش

ہوا چاہتا ہوں“

جو لوگ یہ کہہ دیتے ہیں کہ جس طرح امام حسینؑ لڑ گئے امام حسنؑ بھی کیوں نہیں لڑ گئے، وہ آنکھیں کھول کر دیکھیں دونوں شہزادوں کے اصحاب و انصار میں جن کو لے کر لڑائی کی جاتی ہے زمین و آسمان سے بھی تو زیادہ کا فرق ہے۔ کیا یہ مخفی ہے

کہ مظلوم کر بلا نے اپنے اصحاب کے حق میں انی لا اعلم اصحابا اوفی ولا خیرا من اصحابی فرمایا ہے اور دنیا کی زبانیں حسینی قافلہ کی وفاداری کی ثنا خوانی میں تفتہ ٹفت اندوز ہیں، اور حق کے ساتھ کہلانے والے نفاق، غداری، نمک حرامی، بیوفائی میں ضرب المثل۔ پھر دونوں کی تکلیف کو متحد کہنا عقل و انصاف کی گردن کو گند پھری سے ریتنا نہیں تو اور کیا ہے۔ صاحب روضۃ الصفا نے لکھا ہے کہ چوں آنجناب (امام حسنؑ) مجھن وضعف اصحاب مشاہدہ نمودہ۔ بھلا حاکم بدرہن، حسین والوں میں کسی کی طرف کوئی ایسی بات منسوب ہو سکتی ہے؟ العیاذ باللہ۔ ان حالات میں اگر امام حسنؑ لڑتے ہی رہتے اور دشمن کے حوالے کر دیے جاتے تو یا آپ کو تنہا چھوڑ کر فوج بھاگ گئی ہوتی، تو ایسی صورت میں بحیثیت جنرل آپ کو کیا کہتے۔ افسر فوج کا سلیقہ تو اسی میں معلوم ہوتا ہے کہ فوج کی لیاقت کا اندازہ کر کے اقدام کرے اور اصل مقصد میں کامیاب رہے، جب بچے کھچے کھچے حالات جو اس وقت ارتخ میں رہ گئے ہیں فوجیوں کی شجاعت و وفا کا کچا چٹھا کھول رہے ہیں تو جس کی آنکھوں کے سامنے واقعات گذر رہے تھے وہ کیا کچھ نہ دیکھ رہا ہوگا۔

جب خود غرض انسان کی خواہش کے خلاف کوئی بات ہوتی ہے تو پھر اس کے عقلی جواز و استحسان سے قطعاً آنکھیں بند کر کے نئی نئی کھونچیں نکالا کرتا ہے چنانچہ صلح حسن کے متعلق بھی یہ فیصلہ زیر بحث ہو گیا ہے کہ صلح کی گفتگو شروع کدھر سے ہوئی؛ اس پر بحث کرنے سے چنداں فائدہ نہیں۔ اگر اس صلح کو صحیح مان لیا جائے

لے میں اپنے اصحاب سے بڑھ کر وفادار اور بہتر کسی کے اصحاب کو نہیں سمجھتا اور جانتا۔

اور اگر صلح غلط ہو تو چاہے کوئی ابتدا کرے نتیجہ پر کیا اثر پڑتا ہے۔ بہر حال یہ مسئلہ بھی معرض گفتگو میں آ گیا ہے۔

علامہ صبان کی منقولہ بالا عبارت سے جو بخاری سے نقل کی گئی ہے ثابت ہے کہ مصالحت کا پیغام پہلے معاویہ نے بھیجا تھا۔ ابن خلدون کی عبارت سے صاف پتہ نہیں چلتا کہ معاویہ نے لکھ بھیجا تو ابتداءً تھا یا جو ابا۔ لیکن سیاق سے ظاہر یہی ہے کہ ابتداءً ہو۔ علامہ صبان نے تصریح کر دی ہے کہ دونوں قولوں میں جمع اس طرح ممکن ہے کہ ابتداءً معاویہ کی طرف سے ہو پھر امام حسنؑ نے لکھا ہو۔ ترجمہ ابن خلدون ج ۲ ص ۷۰ پر یہ عبارت واضح دلیل ہے کہ ابتداءً معاویہ کی طرف سے ہوئی تھی۔

آپ نے اہل عراق کو مجتمع کر کے خطبہ دیا جس میں بعد حمد و درود کے بیان فرمایا، "یا اهل العراق سمحی نفسی عنکم ثلاث، قتل ابی وطحنی و انتھاب بیتی" پھر فرمایا "الا وقد اصبحتم بین قتیلین قتیل بصفین تبکون لہ وقتیل بالنہروان تطلبون بشارہ و اما الباقی فخاذل و اما الباکی فتاکروا ان معاویہ دعا نا ابی امریس فیہ عز و نصفۃ فان اردتم الموت ردنا لا علیہ و حاکمنا الی اللہ بظبا السیوف و ان اردتم الحیوة قبلنا و اخذنا لکم الرضا" لوگوں نے یہ سن کر ہر طرف سے چلا کر

لہ عراق والواتین باتوں نے مجھے اس صلح کی قربانی پر مجبور کیا، ایک پدر بزرگوار کی شہادت دوسرے نشاء طعن بننے اور گھر کے ٹٹنے پر۔

۷۷ اس وقت تمہارے دونوں طرف دو قسم کے مقتول ہیں، ایک صفین کے مقتول جن پر (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کہا صلح قائم رکھے، صلح قائم رکھئے۔

اس عبارت سے واضح ہے کہ:

۱۔ امیر معاویہ نے صلح کا پیغام دیا۔

۲۔ امام حسنؑ اس صلح کو انصاف اور عزت نہیں مانتے تھے صرف الضرورتاً

تبیح المحظورات کی حد تھی۔

۳۔ امام حسنؑ نے فوج سے مشورہ کیا اور اپنے ارادہ جنگ کی تصریح کی۔

۴۔ فوج لڑنے پر آمادہ نہ تھی۔

۵۔ جب قوم نے صلح صلح کی پیچ پکار کی تب آپ کو صلح قبول کرنا پڑی۔

تاریخ کامل ابن اثیر ج ۳ ص ۱۶۲ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ، پہلے خط

معاویہ ہی نے روانہ کیا تھا۔ ابن اثیر کی عبارت کا مطلب ہے کہ جب معاویہ کے

پاس امام حسنؑ کا خط پہنچا تو اُسے روک رکھا۔ اس سے قبل عبداللہ وغیرہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

دور ہے ہو، دوسرے ہروان جن کے خون کا بدلہ چاہ رہے ہو۔ خلاصہ یہ کہ جو باقی ہے وہ

ساتھ چھوڑ رہا ہے، اور جو رو رہا ہے وہ تو بدلہ لیا ہی چاہتا ہے۔ خوب سمجھ لو کہ معاویہ نے ہم کو جس

امر کی دعوت دی ہے نہ تو اس میں عزت ہے نہ انصاف۔ لہذا اگر تم لوگ موت پر آمادہ ہو تو

ہم اس کی دعوت کو رد کر دیں اور ہمارا اس کا فیصلہ خدا کے نزدیک تلوار کی باڑھ سے

ہو جائے، اور اگر تم زندگی چاہتے ہو تو جو اس نے لکھا ہے مان لیا جائے اور جو تمہاری

مرضی ہے ویسا ہو جائے۔

کو معاویہ، حسن علیہ السلام کے پاس روانہ کر چکا تھا۔

بہر حال چاہے کسی طرف سے ابتدا ہوئی ہو، صلح ہوئی اور جو غلط فہمی آج اضطراب کا باعث ہے یعنی صلح کا مطلب یہ کہ معاذ اللہ امام حسن نے معاویہ کو حق پر مان لیا یا معاویہ حق پر ہو گیا۔ امام حسن نے اس اشتباہ کا موقع بالکل باقی نہ رکھا، صلح کے بعد جو خطبہ بیان فرمایا اس میں اس امر کی تصریح کر دی کہ معاویہ حق پر نہیں ہے بلکہ یہ ایک فتنہ ہے۔ اس فتنہ سے بچنے اور مسلمانوں کے خون کی حفاظت کے لیے صلح قبول کی گئی ہے۔

ترجمہ ابن خلدون ج ۴ ص ۸۰۸ کی عبارت ذیل ملاحظہ ہو۔

امام حسن نے کھڑے ہو کر بعد حمد و درود کے کہا:

”ایہا الناس ان الله هداکم باولنا وحقن دماکم  
باخرنا وان لهذا الامر مدۃ والذنیادول والله عز  
وجل یقول لنبیہ وان ادری لعلہ فتنہ لکم ومتاع  
الی حین“

جب اس فقرہ پر پہنچے تو امیر معاویہ نے آپ کو بٹھالیا۔ کیونکہ انہوں نے ان کے خلاف بیان فرمایا۔

لے لوگو! ہمارے اول سے اللہ نے تم کو ہدایت بخشی اور آخر سے تمہارا خون بہایا جانبدار  
کیا حکومت کی ایک مدت ہے اور دنیا چلتی پھرتی چھاؤں ہے۔ اللہ نے نبی کریم سے کہا ہے  
یہ دنیا فتنہ ہے اور مدت مبین تک کا سراپہ ہے۔

کتاب الامتہ والسیاستہ ج ۱ ص ۱۳۶ مطبوع فتوح ادبیر مصر ۱۳۳۱ھ پر ہے کہ جب بعد صلح امام حسن علیہ السلام کو لوگوں نے اُبھارا اور کہا کہ جب معاویہ نے معاہدہ کی پابندی نہیں کرنے کا اعلان کر دیا ہے تو آپ بھی عہد توڑ دیں، اس کا جواب آپ نے یہ فرمایا:

”جو کچھ تم کہتے ہو میں خوب سمجھتا ہوں۔ لیکن بات یہ ہے کہ اگر میں دنیا کی حکومت کے لیے پیش بندی کرتا، دنیا کے لیے کوئی کام کرتا یا دنیا میرا نصب العین ہوتی تو ہرگز معاویہ مجھ سے جنگ میں زیادہ سخت نہ ہوتا۔ اور میری رائے اور رویہ اس کے خلاف ہوتا جو تم اب دیکھ رہے ہو۔ لیکن میں خدا اور تم سب کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ میرا مطلب اور کچھ نہیں صرف تمھاری جان بچانا ہے، تم میں سے رفع فساد کرنا ہے۔ تو تم لوگ خدا سے ڈرو اور قضائے الہی پر راضی رہو۔ اپنے امور خدا کے حوالہ کر دو اور اپنے گھروں میں بیٹھ جاؤ اور ہاتھ روکے رہو ہانک کر یا تو نیکو کار راحت پا جائے یا بدکار سے لوگ امن میں ہو جائیں“

اس عبارت سے بھی ظاہر ہے کہ صلح سے مقصد خون ریزی کا روکنا تھا، اگر صلح نہ کرتے تو خون رائیگاں جاتا۔ اس ارشاد کے آخری جملے خصوصیت سے قابل توجہ ہیں۔ علامہ ابن ابی الحدید معتزلی نے شرح نہج البلاغہ جلد چہارم ص ۲۲ مطبوعہ مبینہ مصر پر لکھا ہے:

”اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر امام حسن کے لیے امکان ہوتا تو ضرور جنگ کرتے۔ لیکن جس کا کوئی مددگار نہ ہو اس کے لیے کیا چارہ

ہے۔ مثل ہے کہ :

”کہیں بے بال و پر باز اڑ سکا ہے“

محدثین و موزنین کی ان تحریروں سے اچھی طرح واضح ہو گیا کہ اعمان و انصار کا فقدان باعث التوائے جنگ ہوا۔ ایسی حالت میں جان بوجھ کر شکست کھانے کو جنگ کرنا کبھی مقتضائے عقل نہیں ہو سکتا۔ صرف ایک ہی صورت باقی تھی کہ مصلح نظر اور مقصد کو زیادہ سے زیادہ محفوظ کرتے ہوئے صلح کر لی جائے اور قاعدہ اقل القبعین جس پر دنیا کے عقلاء کا اتفاق ہے اسی امر کی تائید کرتا ہے۔ مقدمہ میں ظاہر ہی کیا جا چکا ہے کہ صلح سے صرف مقابل کی حقیقت ثابت نہیں ہوتی۔ امام حسنؑ کے بیانات اس امر میں ایسے واضح ہیں کہ پھر کسی تاویل کی بھی گنجائش نہیں رہتی۔ آپ نے بار بار اعلان فرما دیا ہے کہ حق میرا ہے لیکن معاویہ پرست حضرات نے اس موقع پر معاویہ کی حقیقت ثابت کرنے کی سعی نامشکور کی ہے۔ جس کا ان کو جتنا نفع پہنچتا ہے اس سے زیادہ ان کا مذہب داغدار ہو جاتا ہے اور حق یہ ہے کہ مدعیان اسلام میں اگر ایسے لوگ نہ پیدا ہوتے تو اہلبیت اور دین رسول کو جتنا صدمہ پہنچتا ہے نہ پہنچتا۔ اصل یہ ہے کہ مسئلہ خلافت و امامت کو کچھ ایسا مجمع تضاد و تناقص بنا دیا گیا ہے کہ جب ایک طرف سے درست کیا جاتا ہے تو دوسری طرف سے دھچکا پہنچ جاتا ہے اور جب دوسری طرف سے درست کیا جاتا ہے تو کسی اور طرف سے رخنہ نظر آنے لگتا ہے۔ اصحابی کالذجوہر بائہم اقتدیتم اہتدیتم اور الصحابة

لے میرے اصحاب تاروں کے مانند ہیں، جس کسی کی اقتدا کرو ہدایت پاؤ گے۔

کلمہ عدول کہہ کر تو صحابیت کا سن پروف (sin proof) بنا دیا گیا جس سے تمام صحابہ ہر قسم کی نکتہ چینی سے بالاتر ہو جاتے ہیں اور کسی کی اقتدا کی جائے باعثِ نجات ہو جائے اور قرآن کی آواز من عمل مثقال ذرۃ خیرا میرا و من عمل مثقال ذرۃ شرایرہ اور ان الانسان لفی خسر الا الذین آمنوا و عملوا الصالحات بتلاقی ہے کہ اصل معیارِ نجات و تحمین صرف ایمان و عمل ہے اور کوئی معیار اس کے سوا نہیں ہو سکتا۔ صحابہ کی جماعت میں ایک دوسرے سے اس درجہ خلاف ہے کہ اگر ایک کی اقتدا کی جائے تو دوسرے سے عداوت مول لینا پڑتی ہے اور اگر دوسرے کا اتباع کیا جائے تو کسی اور سے اختلاف بغیر چارہ نہیں اسی کا نتیجہ ہے کہ کبھی تو خلافت نرمی دنیاوی حکومت بن جاتی ہے اور اس کی کل خوبیوں کو سلاطین دنیا کے اصول سے لائق تحمین و آفریں قرار دیا جاتا ہے چاہے اس میں قرآن و حدیث کی کیسی ہی مخالفت ہوتی ہو اور کبھی دینی بن جاتی ہے اور اس کا اعتقاد کیے بغیر نجات نداد سمجھی جاتی ہے۔ بھلا یہ کیونکر ممکن ہے کہ خاطرِ خلفائے ثلاثہ کی دلایت و محبت بھی ہو اور اہلبیت معصومین کی اطاعت و مودت بھی، علی بن ابی طالب کی جنت بھی مانی جائے اور طلحہ و زبیر و عائشہ کی حقیقت بھی، علی کی محبت بھی ہو اور معاویہ سے الفت بھی (حالانکہ ایک دوسرے پر لعنت کرتے رہے ہوں) یہ کیونکر

لے میرے اصحاب متاروں کے مانند ہیں جس کسی کی اقتدا کر دے ہدایت پاؤ گے، صحابہ سب کے سب عادل ہیں۔  
 لے جو ذرہ برابر نیکی کرے گا نیکی پائے گا اور جو ذرہ برابر بُرائی کرے گا بُرا دیکھے گا۔  
 لے یقیناً انسان گھائٹے میں ہے سوا اہل ایمان اور نیکو کار کے۔

ہو سکتا ہے کہ امام حسن کی طرف داری بھی کی جائے اور معاویہ کی ہوا خواہی بھی حالانکہ ایک مقتول اور دوسرا قاتل، یہ کب سمجھ میں آسکتا ہے کہ یزید بن معاویہ کی خلافت بھی درست ہو اور امام حسین علیہ السلام کی امامت بھی باقہ سے نہ جائے۔ اسی طرح کی بے شمار تضاد اور ناممکن الاجتماع باتیں لوگوں کو خبط عشوار میں مبتلا ہونے پر مجبور کرتی ہیں۔ خلافت پر بحثیں ہو چکی ہیں اس موقع پر طول دینا مقصود نہیں۔ بہر حال شیعوں کی حیثیت اس باب میں واضح اور بالکل غیر مشتبہ ہے یعنی اہلبیت اور محض اہلبیت تمام معاملات میں حق پر تھے۔ اہلبیت طاہرین کی غیر مشروط اطاعت و محبت واجب ہے اور ان کے مخالفین و محاربین قطعاً غلطی پر تھے اور اس بنا پر ان سے نفرت و بیزاری لازمی ہے (دیکھو کتب اسلامیہ)۔ اہلبیت اور ان کے مخالفین دونوں کو، سر حق سمجھنے کا گورکھ دھندا تمام اہلسنت کی عقائد و کلام کی کتابوں میں پھیلا ہوا ہے۔ چنانچہ ایک طرف تو معاویہ پر تہ کا یہ زور کہ صاحب صواعق محرقہ نے ”تطہیر الجنان واللسان عن المحظور والتقویٰ بثلث سیدنا معاویۃ بن ابی سفیان“ نام کی کتاب لکھ ماری۔ دوسری طرف امام نسائی غریب نے جب منبر و مشق پر فضائل اہلبیت بیان کیے اور کسی نے پوچھا کچھ معاویہ کے متعلق بھی ارشاد ہو، امام نسائی نے فرمایا کہ اگر معاویہ سر بسر ہو جائیں یہی کیا کم ہے کہ ان کی کوئی فضیلت بیان کی جائے۔ مجھے تو ان کے حق میں سوائے لا اشبع اللہ بطنہ (خدا اس کا پیٹ کبھی نہ بھرے) اور کوئی حدیث نہیں ملتی۔ جس کے نتیجے میں منبر سے کھینچ کر مدعیان اسلام و تسنن نے ایسی رسوائی سے امام صاحب کی مرمت کی کہ وہ جاں بحق ہو گئے (دیکھو تاریخ ابن خلکان، اور اس پر طرہ اور لطیفہ یہ ہے کہ آج اہلسنت دونوں (ابن حجر اور نسائی) بزرگوں کو امام بھی کہہ چلے جاتے

ہیں۔ مثالیں بہت ہیں کہاں تک بیان کی جائیں۔

اب ہم اس موقع پر مولوی عبید اللہ صاحب سہیل امرتسری کی کتاب ارجح المطالب مطبوعہ لاہور ۱۹۷۲ء باب چہارم کی عبارت لفظ بہ لفظ نقل کرتے ہیں جس سے معاویہ کے متعلق رائے قائم کرنے میں سہولت ہوگی۔ یہ تحریر امیر المؤمنینؓ اور معاویہ کی جنگ کے متعلق ہے، اسی سے یہ بھی پتہ چلنا آسان ہو جاتا ہے کہ امام حسنؑ کے لیے کیا مجبوری تھی کہ آپ نے صلح کی جب معاویہ پرستی کی حد آج یہ ہے کہ صاحب ارجح المطالب کو اس کی رد اور اس پر استدلال کرنے کی ضرورت ہے، تو جب معاویہ شاہی رہی ہوگی اس وقت کس کی طاقت تھی جو معاویہ کو از سر تا پا برسر حق نہ کہتا۔ صاحب ارجح المطالب لکھتے ہیں:

”جناب امیر کناکشین اور قاسطین اور مارقین سے جنگ کرنا۔

علقہ اور اسود کہتے ہیں کہ جب ابویوب انصاری رضی اللہ عنہ صقین

سے لوٹے تو ہم ان کے ملنے کو گئے۔ ہم نے ان سے کہا اے ابویوب!

بے شک اللہ تعالیٰ نے آپ پر کرم کیا کہ تمہارے گھر میں جناب رسول اللہ

صلی اللہ علیہ (وآلہ) وسلم فروکش ہوئے اور یہ خدا کی مہربانی خاص تمہارے

لیے تھی کہ حضرت کی اونٹنی اور لوگوں کے سوا تمہارے گھر کے دروازے

پر بیٹھ گئی، اب آپ کندھے پر شمشیر رکھ کر تشریف لائے ہیں کہ اس سے لا الہ

الا اللہ کہنے والوں کو قتل کریں۔ ابویوب انصاری کہنے لگے، تحقیق جاب

رسالت مآب صلی اللہ علیہ (وآلہ) وسلم نے ہم کو جناب امیر کی معیت میں تین

گروہوں کے ساتھ جنگ کرنے کا حکم دیا تھا۔ وہ لوگ ناکشین اور قاسطین

اور مارقین ہیں۔ پس ناکشین اہل جبل یعنی طلحہ و زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہما، تھے اور قاسطین یہ لوگ ہیں جہاں سے کہ ہم واپس آ رہے ہیں یعنی معاویہ اور عمرو بن عاص اور مارقین اہل طرفا اور خیلان اور نہروان ہیں، مجھے نہیں معلوم کہ اب وہ کہاں ہیں؟ لیکن انشاء اللہ ان کے ساتھ بھی لڑنا ہے۔“

### تنبیہ :

سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جناب امیرؓ کو اپنے عہد خلافت میں تین معرکے پیش آئے :

(۱) واقعہ جمل (۲) واقعہ صفین (۳) واقعہ نہروان

واقعہ جمل میں دونوں جانب سے صحابہ کرام تھے۔ اس واقعہ پر گہری نظر کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ اصحاب جمل یعنی طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما نے نکتہ بیعت تو ضرور کیا ہے مگر ان کا منشاء جناب امیرؓ سے نہ نزع خلافت کا تھا اور نہ لڑنے ہی کا ارادہ تھا۔ بلکہ واقعات پر غور کرنے سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ جنگ میں بھی مبادرت ان سے نہیں ہوئی صرف وہ قاتلان جناب عثمان کے مستدعی تھے جو بخوف جان جناب امیرؓ کی فوج میں آچھپے تھے۔ انھوں نے موقع پا کر دونوں لشکروں کو لڑوا دیا۔ مگر جب جناب امیرؓ نے طلحہ و زبیر کو ان کی خطا پر متنبہ کیا تو

لے ناکشین میں ہونا جن کے ساتھ لڑنے کا حکم خود رسول نے دے گئے، پھر رضی اللہ کا طرہ سر پر سبحان اللہ! لے رسول نے ناکشین کی مذمت کی ہے نہ کہ ان کے مشارکی۔

وہ نادام ہو کر فوراً معرکے سے علیحدہ ہو گئے اس لیے ان کی خطائی الاجتہاد سے علماء نے تعبیر کیا ہے۔

۲۔ معرکہ صفین میں تمام مہاجر اور انصار جناب امیر کے طرفدار تھے، معدودے چند موثقہ القلوب صحابہ امیر معاویہ کی طرفداری کرتے تھے۔ واقعات پر نظر کرنے سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ امیر معاویہ کی منشا اس جنگ سے نزع خلافت کی تھی۔ گو تاثرین ان کے فعل کو کسی لفظ سے تعبیر کریں مگر خطائے منکر ہی کا پلہ بھاری رہتا ہے۔

۳۔ واقعہ نہروان میں کوئی صحابی جناب امیر کے مخالف نہیں ہوا اس لیے اس کی بحث کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ واقعہ جمل کی بحث صفین کے واقعہ کی بحث میں ضمناً درج ہے اس واسطے اہل صفین کے اس فعل کی نسبت مفصلہ ذیل بحث درج کی جاتی ہے:

”ابن عمر کہا کرتے تھے کہ اس امت کے لوگوں میں سے قیامت کے روز سے پہلے خدا کے سامنے علی اور معاویہ باہم جھگڑنے کے لیے کھڑے ہوں گے۔“

(مناقب الصحابہ)

۱۔ اس تاویل کی کمزوری واضح ہے مگر کیا کیا جملے کہ سُنیت کا عقیدہ رکھتے ہوئے سوائے اس کے اور کیا کریں، درنہ واضح ہے کہ علی بن ابی طالب سے جنگ کو احادیث میں صاف صاف کفر بتا دیا جا چکا ہے۔ اگر امر رسول کی پابندی ہے تو علی کے مقابلہ والوں کو صاف صاف ناحق پر کہنا چاہیے۔ یہ لطف بھی مزید ہے کہ امیر معاویہ کی منشا تو خلافت لینا تھی اور طلحہ و زبیر کی منشا باوجود تفریح امیر المؤمنین نزع خلافت نہ ماننا کیا ثوب فیصلہ ہے۔

تمہید :

یہ امر واضح ہے کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کا شرف اعلیٰ مدارج تعظیم اور کثرت ثواب کا مجوز اور تزاہد حسنات کا موجب ہے۔ کوئی شرف خواہ کیسا ہی کیوں نہ ہو اس کی حد تک نہیں پہنچ سکتا۔ لیکن ہم اہلسنت والجماعت کے نزدیک انبیاء کرام علیہ السلام کے سوا کوئی صاحبِ خواہ کتنا ہی جلیل القدر کیوں نہ ہوں معصوم نہیں۔ البتہ وہ عظیم الشان اصحاب کبار جن کے فضائل مناقب متواترات کی حد تک پہنچ چکے ہیں، محفوظ عن الخطا سمجھے جاتے ہیں اور ان بزرگوں کی شان میں صدور معصیت کا گمان کرنا سراسر ظنِ فاسد ہے۔

اس امر کے متعین کرنے میں کہ وہ افاضل صحابہ کون ہیں اور کتنے ہیں جن کے فضائل تو اتنی حد تک پہنچ گئے ہیں۔ علمائے کرام نے نہایت دقت نظر سے کر کے یہ نتیجہ نکالی ہے کہ جو بزرگوں اور صلح حدیثیہ تک اسلام سے شرف ہوئے ہیں وہ ہر طرح سے افضل اور اعلیٰ ہیں اس کے بعد پھر کوئی ایسا مشہد نہیں جو معیارِ فضل سمجھا جائے کیونکہ بعد میں اکثر مناقب بھی شریکِ اسلام ہو گئے تھے چنانچہ شاہ عبدالعزیز صاحبِ محدث

---

لے جب تک ایمان اور عمل صالح کی شرط نہ ہو صحبت بجائے شرف ہونے کے منافقت اور وبال ہوگی۔  
 لے استدلال سے کچھ واسطہ نہیں صرف دعویٰ ہے۔ آیت تطہیر جن لوگوں کے حق میں ہے اس عہدے واضح ہے فضائل و مناقب کی کثرت سے غلط کار منافقین ہرگز محفوظ عن الخطا نہیں ہو سکتے۔  
 لے بظاہر ان سب کو آپ محفوظ عن الخطا کہنا چاہتے ہیں لیکن ان میں منافقین کی تعداد کافی موجود تھی۔ محفوظ ہونا تو کجا۔

وہلوی اپنے رسالہ سراج الجلیل میں لکھتے ہیں (در میان صحابہ سبقت تقدم را بموجب) لا یتسوی منکم من انفق قبل الفتح وقاتل اعظم درجات من الذین انفقوا من بعد وقاتلوا اعتبار باید کرد زیرا کہ ہر قدر تقدم و سبق بیشتر وقت احتیاج اسلام و تقویت آن بیشتر چنانچہ حدیث صدقت و قلتہ کذبت دلالت بر آن دارد پس باین اعتبار کسانیکہ قبل از ہجرت باعمال اسلام قیام نموده اند افضل باشند از من بعد خود مثل ابو بکر و عمر و عثمان و علی و حمزہ و جعفر و عثمان بن مظعون و طلحہ و زبیر و مصعب بن عمیر و عبد الرحمن بن عوف و عبد اللہ بن مسعود و سعید بن زید و زید بن حارثہ و ابو عبیدہ و بلال و سعد و عمار بن یاسر و ابو سلمہ بن عبد الاسد و عبد اللہ بن تحش و غیر ہم من نظر کریم بعد از اہل اہل عقبہ یا اہل بدر بعد باز از اہل مشاہد احد تا آنکہ نوبت بصلح حدیبیہ رسید زیرا کہ از اہل سکینہ و صفائی قلوب ایشان منصوص بنص قرآنی است۔ اما بعد از اہل پس بالقطع بیچ شہدے نیست کہ بدر افضل بر آن بوده باشد زیرا کہ دریں شہد جماعت منافقین بودند، قول تعالی و من حولکم من الاعراب منافقون و من اهل المدینة مرد و اعلى النفاق۔

جہاں تک نصوص قرآنی کو دیکھا جاتا ہے تو وہ بھی انہیں بزرگوں کی علوشان کے متعلق پائے جاتے ہیں۔ علامہ ابن عبد البر استیعاب فی معرفتہ اصحاب میں لکھتے ہیں، قال اللہ تبارک و تعالیٰ محمد رسول اللہ و الذین معہ اشذاع علی الکفار رحماء بینہم قرعہم رکعاً سجداً یتغنون فضلاً من اللہ و رضوانا الخ۔ فلہذا صفة من بدر الی تصدیقہ و الایمان بہ وازدہ لغزہ و تصق بہ و صحبہ و لیس کذالک جمیع من رآہ و لاجمع من آمن

وسترى منزلهم من الدين والايامات وفضائل ذوى الفضل التقدم منهم  
 فالله تعالى فضل بعض النبيين على بعض وكذلك سائر المسلمين قال  
 الله تبارك وتعالى السابقون الاولون من المهاجرين والانصار والذين  
 اتبعوهم باحسان رضى الله عنهم ورضوا عنه "يعنى پروردگار تعالیٰ شانہ  
 فرماتا ہے محمدؐ اللہ کا رسول ہے، اور جو اس کے ساتھ ہیں زور آور ہیں، کافروں  
 پر نرم دل ہیں آپس میں تو دیکھے ان کو رکوع میں اور سجدے میں ڈھونڈتے ہیں اللہ  
 کا فضل اور اس کی خوشی، نشانی ان کے منہ پر ہے سجدہ کے اثر سے، یہ کہاوت ہے  
 ان کی توریت میں، اور یہ کہاوت ہے ان کی انجیل میں۔ پس جن لوگوں نے حضرت  
 کی تصدیق کی اور مدد میں مبادرت کی ہے اور آپ کی صحبت میں رہے ان کی  
 یہ صفت ہے جس کو خدا نے اپنے کلام پاک میں بیان فرمایا ہے اور ہر ایک شخص  
 کہ جس نے حضرت کو دیکھا ہے ایسا نہیں ہے اور نہ ہر ایک شخص ایمان لایا ہے  
 ایسا ہو سکتا ہے۔ عنقریب ہے کہ دین و ایمان میں تو ان کے درجوں کو دیکھے گا  
 اور صاحبان فضل کی فضیلتیں اور ان کے تقدم کو شناخت کرے گا، پس خدائے تعالیٰ  
 نے بعض نبیوں کو بعض پر فضیلت دی ہے۔ اسی طرح سے تمام مسلمانوں کو ایک  
 دوسرے پر فضیلت عطا فرمائی ہے۔ خداوند تعالیٰ فرماتا ہے جو لوگ قدیم میں پہلے  
 وطن چھوڑنے والے اور مدد کرنے والے اور جو ان کے پیچھے آئے نیکی سے اللہ  
 ان سے راضی ہوا اور وہ اس سے راضی ہوئے۔"

اس آیت کی تفسیر میں علامہ موصوف ابن سیرین سے روایت کرتے ہیں

السابقون الاولون من المهاجرين والانصار هم الذين صلوا

القبلتین یعنی سابقون الاولون سے وہ لوگ مراد ہیں جن لوگوں نے دونوں قبلوں کی طرف نماز پڑھی ہے۔ اور شعبی سے روایت ہے الذین بايعوا بيعة الرضوان یعنی سابقون الاولون سے وہ لوگ مراد ہیں جو بیعت رضوان سے شرف ہوئے اور ان کی تعداد کی نسبت علامہ ابن البرکھتہ ہیں عن سالم بن ابی الجعدۃ قال سالت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ من اصحاب الشجرة قال کنا الفا وخمس مائة یعنی سالم بن ابی الجعدہ کہتے ہیں کہ میں نے جابر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اصحاب شجرہ کی تعداد کی نسبت پوچھا، وہ فرمانے لگے ہم پندرہ سو آدمی تھے۔

دوسری روایت میں ہے: عن عمرو قال سمعت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ یقول کنا الفا واربعمائة فقال لنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انتم الیوم خیار اهل الارض یعنی عمرو روایت کرتے ہیں کہ میں نے جابر بن عبد اللہ سے سنا ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ ہم صلح حدیبیہ کے روز چودہ سو آدمی تھے، پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہم سے ارشاد فرمایا کہ تم آج کے دن تمام زمین کے باشندوں سے بہتر ہو۔ گو بظاہر ان دونوں حدیثوں میں تعداد کی نسبت فرق ہے، لیکن کہا جاسکتا ہے کہ چودہ سو سے کم اور پندرہ سو سے زیادہ اس وقت صحابی نہیں تھے۔ پس جو اصحاب کبار کہ ان شاہدہ میں حاضر ہوئے ہیں وہ بے شبہ قطعی جنتی اور افاضل صحابہ ہیں۔ علامہ ابن عبد البر استیعاب میں لکھتے ہیں: قال ابو عمرو وقال اللہ تعالیٰ رضی اللہ عنہ من المؤمنین اذ یبايعونک تحت الشجرة ومن رضی اللہ عنہ لم یسخط علیہ

ابدًا انشاء اللہ تعالیٰ۔ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لن یصلح النار احد شہد بدراً والحدیبۃ۔ یعنی ابو عمر کہتے ہیں کہ پروردگار عالم جل جلالہ فرماتا ہے، خدار ارضی ہو مومنوں سے جب کہ انھوں نے درخت کے نیچے تجھ سے بیعت کی اور جس سے کہ خدار ارضی ہو اس پر کبھی ناراض نہیں ہو گا انشاء اللہ تعالیٰ۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ ہرگز وہ شخص دوزخ میں نہیں ڈالا جائے گا جو بدر اور حدیبیہ میں حاضر ہوا ہے غرضیکہ یہ فضائل ان بزرگوں کے ہیں جو صلح حدیبیہ تک مشرف بہ اسلام ہوئے ہیں اگرچہ بعد میں بھی جو اصحاب کہ مشرف بہ اسلام ہوئے ہیں ان کے فضائل و مناقب بھی حصر میں نہیں آسکتے۔ خاص کہ جناب سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار کا شرف اور صحبت کا ثواب ایسا ہے کہ جس کے سامنے سب خوبیاں گم رہیں۔ تاہم باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شرف صحبت کے کل صحابہ کا محفوظا عن الخطا سمجھنا بدیہیات اور معتقدات سلف صالحین کے برخلاف ہے۔

علامہ سعد الدین تفتازانی شرح مقاصد میں لکھتے ہیں، اذ لیس کل صحابی معصوم وکل من رای النبی صلعم بالخیر موسوما یعنی جب کہ کل صحابی معصوم نہیں اور نہ ہر ایک شخص کہ جس نے آنحضرت صلعم کو دیکھا ہے نیکی کا نشان رکھنے والا ہے۔

سطح بن اثاثہ کا جناب ام المومنین عائشہ صدیقہ کے قذف میں شریک ہونا اور عاتب بن ابی بلتعہ کا آنحضرت کے راز کو افشاء کرنا اور کفار مکہ کی طرف پوشیدہ خط لکھ کر روانہ کرنا ولید بن عقبہ بن ابی معیط کا شرب خمر کرنا اور ایک صحابی کا غزوہ خیبر

میں خود کشی کرنا اور ایک صحابی کا زنا کرنا اور ایک صحابی کا منع زکوٰۃ کرنا اور بعض عرب کے قبائل کا آنحضرت کی رحلت کے بعد مرتد ہو جانا، جن کی تنبیہ کے لیے حضرت ابو بکر صدیق نے شکر کشی فرمائی، ایسے واقعات ہیں کہ جن سے ثابت ہوتا ہے کہ کل صحابہ محفوظ عن الخطا نہیں تھے اور ان امور کا بعض صحابہ سے سرزد ہونا محفوظ عن الخطا ہونے کے متناقض ہے۔

جب بعض صحابہ کا یہ حال ہے تو پھر کون سی ایسی وجہ لاحق ہے کہ جس کی وجہ سے ہم امیر معاویہ کو خلیفہ برحق پر بغاوت کرنے میں معذور یا مخطی یا مجبور تصور کریں اور ان کے اس فعل کو معصیت قرار دینے میں کون سی قباحت لازم آتی ہے۔

(تبصوۃ): امیر معاویہ فاضل صحابہ میں سے شمار نہیں کیے جاتے، وہ ہجرت میں شریک ہوئے ہیں، بدر میں نہ بیعت رضوان میں کہ ان کے مناقب منصور تصور کیے جائیں۔ ان کا اسلام تو بعد مکہ کی فتح کے ہوا ہے جس میں بقول شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی منافق بھی شریک اسلام ہو گئے تھے۔ علامہ ابن عبدالبر استیعاب میں بذیل ترجمہ امیر معاویہ تحریر کرتے ہیں، هو وابوہ واخوہ من مسلمتا الفتح یعنی امیر معاویہ اور ان کے والد ابوسفیان اور ان کا بھائی فتح مکہ کے مسلمانوں میں سے تھے۔

امیر معاویہ عام صحابہ بلکہ مؤلفۃ القلوب کے گروہ سے سمجھے جاتے ہیں قال ابو عمرو معاویۃ وابوہ من المولفۃ قلوبہم۔ (الاستیعاب للعلامة ابن عبدالبر واسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ لابن اشیر الجوزی واصابہ فی تمیز الصحابہ لابن حجر و تاریخ الخلفاء للسیوطی)۔

ہاں اس مصیبت پر اُن کے ارتکاب کو بوجہ شرف صحبت سرور عالم صلعم شفاعت نبوی و معافی مرتضوی و عفو خدا کا امیدوار سمجھنا چاہیے اور ان کو بد الفاظ سے یاد کرنا سخت بُرائی ہے۔ البتہ اُن کو ماجور اور اُن کے اس فعل کو خطا فی الاجتہاد سمجھنے پر چند اعتراض وارد ہوتے ہیں۔

اولاً۔ ظاہر ہے کہ کل صحابہ مجتہدین نہیں تھے۔ چنانچہ علامہ شہاب الدین احمد بن قاسم العباری آیات بینات میں لکھتے ہیں: الصحابة تنقسم الى المجتهدين وعوام یعنی صحابہ کی دو قسمیں ہیں، مجتہدین اور عوام۔ ہم کو امیر معاویہ کی چند محدثات کے سوا جن کی تفصیل ہم آگے چل کر بیان کریں گے اُن کے اجتہاد کی کوئی نظیر نظر نہیں آتی جس کی وجہ سے ہم ان کو صحابہ مجتہد کی قسم سے شمار کر سکیں۔ دوم۔ اگر تسلیم بھی کر لیا جائے کہ امیر معاویہ مجتہد ہی تھے لیکن یہ امر ضروری ہے کہ مجتہد کے قیاس کے لئے اولاً ثلثہ شرعیہ یعنی کتاب و سنت و اجماع سے کسی دلیل کا ماخذ ہونا لازم ہے مگر اُن کے اس فعل میں (یعنی خلیفہ وقت سے محاربہ کرنے میں) اولاً مذکورہ سے کسی شرعی دلیل کا ماخذ ہونا ثابت نہیں ہوتا کہ امیر معاویہ نے خلیفہ وقت کی اطاعت سے انحراف کرنے میں کسی آیت یا حدیث یا مسئلہ اجماعی سے تمسک کیا ہو۔

سوم۔ مجتہد کو اپنے اجتہاد کرنے میں یا کسی کو راہ صواب کی طرف مائل کرنے میں شمشیر نکالنا اور معرکہ قتال آراستہ کرنا جس میں ہزار ہا بے گناہ مسلمانوں کی جان تلف ہو جائے، ہرگز جائز نہیں۔

چہارم۔ وہ جیلد جس سے معاویہ اور ان کے متبعین کو معذور ٹھہرانے میں

کوشش کی جاتی ہے صرف یہ ہے کہ یہ لوگ حضرت عثمان کے قاتلوں سے قصاص کے طالب تھے نہ خلیفہ وقت سے انتزاعِ خلافت کے۔ علامہ ابن حجر نے اسی بات پر زور ڈالا ہے کہ جناب امیر علیہ السلام سے امیر معاویہ کی معرکہ آرائی صرف قتلہ جناب عثمان کے طلب کرنے کے لیے تھی۔ چنانچہ وہ صواعقِ محرقہ میں لکھتے ہیں:

ومن اعتقاد اهل السنة والجماعة ان ماجرى بين معاوية وعلی من الحروب فلم يكن المنازعة في الخلافة للاجماع على حقيقتها لعلی یعنی اہلسنت والجماعت کے اعتقاد میں سے ہے کہ جو محاربات امیر معاویہ اور جناب علی کے درمیان واقع ہوئی ہیں وہ خلافت کا جھگڑا نہیں تھا کیونکہ جناب علی کے خلافت کے حق ہونے پر اجماع ہو چکا تھا۔ علامہ ابن حجر اور ان کے بعض ہم خیال بزرگوں کو اس لیے میلک اختیار کرنا پڑا ہے کہ یہ خیال کیا جائے کہ جس غرض کے لیے جناب صدیقہ اور ظلم اور نہیر نے جناب امیر پر خروج کیا تھا اسی غرض میں امیر معاویہ بھی شریک سمجھے جائیں تاکہ اصحابِ جمل کی بریت پر جو اولہ قائم ہو سکتے ہیں وہی ان کی برات پر قائم ہو سکیں۔ لیکن یہ بالکل خلافِ نفس الامر ہے، واقعات چھپائے سے چھپ نہیں سکتے۔

ادلاً۔ اس امر پر تمام اہلسنت کا اتفاق نہیں ہے کہ امیر معاویہ کی غرض اس قتال و جدال سے جناب عثمان کے قاتلوں کا طلب کرنا تھا اور خلافت پر تنازع نہیں تھا۔ چنانچہ عبدالشکور السامی التہید فی بیان التوجید میں لکھتے ہیں، وقال اهل السنة والجماعة بان معاوية في حال الحيوة على ومن تابعه كانوا مخطئين في دعوى الامارة والبيعة والباغين في المقاتلة مع علی یعنی اہلسنت والجماعت کہتے ہیں کہ امیر معاویہ اور ان کے پیروجناب علی کی زندگی میں امارت اور بیعت

کے دعوے کرنے میں خطا وار تھے اور جناب علی کے ساتھ جنگ کرنے میں باغی تھے۔  
 یہی وقت قاضی شہداء اللہ صاحب پانی پتی "سیف المسلمون" میں لکھتے ہیں:

"بعض گویند کہ معاویہ در ابتدا طلب قاتلان عثمان می کرد و در آخر  
 طلب خلافت ہم نمودہ بود و بصحت خلافت علی قائل نبود و می گفت کہ بیعت  
 او باشان با علی معتبر نیست و اہل حل و عقد صحابہ مثل طلحہ و زبیر و غیرہ کہ بیعت  
 کردہ بودند با کراہ کردہ بودند و لہذا نکث بیعت نمودند و معاویہ از پیغمبر خدا  
 صلی اللہ علیہ وسلم شنیدہ بود و اذا ملکک فارق بھم ازین حدیث اورا  
 طبع خلافت ہم رسیدہ بود از اہل شام بیعت گرفتہ بود۔"

(دوم) اگر معاویہ کا مقصود محض قصاص کا طلب کرنا تھا تو لازم تھا کہ اُن کی ہمت  
 صرف حضرت عثمان کے قاتلوں کے طلب کرنے ہی پر مقصود ہوتی اور اسی پر اکتفا کرتے  
 تخیال اور بیعت المال میں دست اندازی نہ کرتے لوگوں سے اپنے نام کی بیعت  
 نہ لیتے اور کبیر الروم کو مال کثیر دے کر صرف جناب امیر کے ساتھ جنگ کرنے کے لیے  
 صلح نہ کرتے۔ مسعودی علیہ الرحمہ مروج الذهب میں لکھتے ہیں:

قد کان معاویۃ صالح الروم علی مال یحمله الیہ لشغلہ بعلی  
 یعنی امیر معاویہ نے ملک الروم کو مال دے کر اس لیے صلح کر لی تھی تاکہ علی کے جنگ  
 کرنے میں مشغول ہوں اور اپنے عامل عمرو بن العاص کو بھیج کر جناب امیر کے عامل  
 محمد بن ابی بکر سے مصر کو نہ چھین لیتے۔ اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ میں علامہ ابن اثیر  
 الجزری بذیل ترجمہ عمرو بن العاص لکھتے ہیں:

ثم سیرہ معاویہ الی مصر فاستنقذھا من ید محمد بن ابی بکر

وہو عامل لعلی علیہا واستعملہ معاویہ علیہا یعنی پھر امیر معاویہ نے اس کو مصر کی طرف روانہ کیا اور اُس نے مصر کو محمد بن ابی بکر سے چھین لیا، اور وہ جناب علیؑ کی طرف سے اس پر عامل تھے۔ پھر امیر معاویہ نے اس پر عمرو بن عاص کو اپنا عامل مقرر کیا۔ یہ اور نیز اسی قسم کے صد ہا دیگر واقعات ایسے موجود ہیں کہ جن سے ثابت ہوتا ہے کہ امیر معاویہ کو دراصل خلافت کی طمع تھی۔

سوم۔ جب کہ تکلیف ہو چکی تھی اور عمرو عاص نے ابو موسیٰ کو مغالطہ دے کر بحق امیر معاویہ فیصلہ کیا تھا تو ضعیف سے ضعیف روایت بھی اس کی تائید نہیں کرتی کہ امیر معاویہ نے اس ناجائز تکلیف پر عمرو بن عاص کو سزائے کی ہو پس اگر امیر معاویہ مدعی خلافت نہیں تھے تو ایسی ناجائز تکلیف پر کیوں راضی ہو گئے تھے۔

چہارم۔ جب امام حسنؑ نے خلافت سے دست کش ہو کر امارت عامہ ان کے سپرد کی اور امیر معاویہ کو ان کے حسب منشاء اقتدار کلتی حاصل ہو گیا تھا تو آیا کسی ضعیف روایت سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ پھر کبھی امیر معاویہ نے جناب عثمان کے قاتلوں کی جستجو کی ہے یا اس جماعت پر قصاص کے جاری کرنے کا حکم شہر کیا ہے باوجودیکہ حضرت عثمان کی شہادت سے امیر معاویہ کی امارت عامہ تک چھ سال سے زیادہ کا عرصہ نہیں گزرا تھا، اور یہ امر ہر گز خیال میں نہیں آتا کہ اس قلیل مدت میں حضرت عثمان کے قاتل کلم رہ گراے عدم ہو گئے ہوں اور اس جماعت کثیر سے ایک تنفس بھی زندہ نہ رہا ہو، جس سے قصاص طلب کیا جاتا۔ خیر بہ طریق تنزل ہم یہ بھی تسلیم کر لیتے ہیں کہ امیر معاویہ کا مقصود اس محاربہ سے جناب عثمان کے قاتلوں کو طلب کرنا تھا۔ اب ہم یہ پوچھتے ہیں کہ اگر اس بغاوت

میں امیر معاویہ کو معذور سمجھا جائے تو اُن کے مقلدین کو بھی معذور خیال کرنا چاہیے، پس بصورت ذیل:

(الف) اگر کوئی شخص بادشاہ اسلام سے بدیں وجہ بغاوت اختیار کرے کہ چونکہ یہ بادشاہ فلاں مقتول مسلمان کے قاتلوں سے قصاص نہیں لیتا اس لیے میں اُس کے ساتھ جنگ کرتا ہوں اور میں اس امر میں امیر معاویہ کا مقلد ہوں، تو آیا کوئی فقہی جزیئہ اس کی تائید کے لیے پیش کیا جاسکتا ہے یا کوئی عالم اس تقلید میں اس کو معذور سمجھ سکتا ہے۔

(ب) مقتول کے خون کے لیے عند الشرع دعویٰ کرنا محض اسی طرح جائز ہے کہ قاضی کی طرف رجوع کیا جائے اور شہود پیش کر کے دعویٰ کو پایہ ثبوت تک پہنچایا جائے اور پھر شریعت کے فیصلہ کو تسلیم کیا جائے نہ یہ کہ بادشاہ وقت پر شمشیر نکالی جائے اور اس کی معزولی کے درپے ہو جائے۔

(ج) اگر اس بغاوت کو خطائی الاجتہاد کے بھی ایک ثواب حاصل ہوتا ہے اور عند اللہ معذور بلکہ ماجور ہوتا ہے، تصور کیا جائے تو بالفرض اگر جناب امیر علیہ السلام اس معرکہ قتال میں مثل اپنے دیگر صحابیوں کے شہید ہو جاتے تو ضرور ہے کہ جناب امیر کا قتل بھی خطائی الاجتہاد ہوتا اور جناب امیر کے قاتل اشقی الآخین کو بھی عند اللہ معذور بلکہ ماجور سمجھا جاتا۔ (نعوذ باللہ من ہذا الاعتقاد)

(د) اگر معاویہ بغاوت میں مخطی ماجور تھے تو اُن کے لشکر سے جس نے کہ جناب عمار یا سررضی اللہ عنہ کو شہید کیا ہے اس کو مخطی ماجور کہنا پڑے گا، کیونکہ یہ فعل اُس نے بغرض اتباع امیر معاویہ کیا ہے۔

(د) ولو فرضنا اگر جناب امیر علیہ السلام سے جنگ کرنا خطافی الاجتہاد تھا تو کیا جناب امیرؓ کی شان اقدس میں برسر محراب و منبر سب و شتم کرنا بھی خطافی الاجتہاد تھا؟

عن سعدان معاویة امره فقال ما يمنعك ان تسب ابا التراب فقال اما ذكرت ثلاثا قالهن رسول الله صلعم في بعض مغازيه فقال له خلفتني من النساء والصبيان... اهل بيتي (اخرجه احمد والمسلم والترمذی والنسائی وغيرهم) سعد سے روایت ہے کہ امیر معاویہ نے اُن کو جناب ابو تراب علیہ السلام پر سب کرنے کے لیے حکم کیا، اور کہا تم ان پر سب کیوں نہیں کہتے؟ سعد نے کہا کیا میں نے تم سے تین باتوں کا ذکر نہیں کیا کہ رسول خدا صلعم نے ارشاد کی ہیں۔ حضرت نے علیؓ کو بعض غزوات میں جب کہ اپنے عقب میں چھوڑا تو انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ مجھے عورتوں اور لڑکوں کے پاس چھوڑے جاتے ہیں۔ حضرت نے اُن سے فرمایا کیا تو راضی نہیں کہ تیری منزلت مجھ سے ایسی ہو جیسے ہارون کی موسیٰ سے مگر نبوت میرے بعد نہیں ہے اور میں نے خیر کے روز حضرت کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ہم علم کل ایسے شخص کو دیں گے جو خدا اور رسول سے پیار کرتا ہے پس ہم علم کی طرف بڑھے اور آپ نے ارشاد کیا علیؓ کہاں ہیں وہ اُن کی خدمت میں آشوب چشم ہی سے حاضر ہوئے۔ حضرت نے اپنا لعاب ہن اُن کی آنکھوں میں لگا کر علم اُن کو دیا اور اللہ نے ان کو فتح دی، اور جب یہ آیت نازل ہوئی: "پس کہہ دو اُو بلائیں ہم اپنے بیٹوں کو اور تمہارے بیٹوں کو اور اپنی عورتوں کو اور تمہاری عورتوں کو اور اپنی جانوں کو اور تمہاری جانوں کو" حضرت نے علیؓ، فاطمہ اور حسینؓ کو بلا کر فرمایا اسے میرے پروردگار! یہ میرے اہل بیت ہیں۔

یہ حدیث تو صحاح کی ہم نے پیش کی ہے، اسی قسم کی صد ہا حدیثیں ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ امیر معاویہ نے اس بدعت کو خطبہ میں ایجاد کیا تھا جو خلیفہ عمر بن عبد العزیز کے عہد تک جاری رہی اور اس نامور خلیفہ نے اُس کو منسوخ کیا۔ یہ ایسے واقعات حقیقہ ہیں کہ جس سے کسی نے انکار نہیں کیا۔ پس کیا یہ امور اور بدعت سید بھی خطافی الاجتہاد ہو سکتے ہیں، حاشا وکلا۔ اکثر لوگوں کو مفصلہ ذیل اوہام میں سے ایک نہ ایک وہم نے اس محاربہ کو خطافی الاجتہاد کہنے کی طرف مائل کیا ہے، جن کی تفصیل مع جوابات درج ہے :

پہلا وہم۔ اگر اس محاربہ کو معصیت قرار دیا جائے تو اس سے اہل شام کی تکفیر لازم آتی ہے، اور یہ امر دور تک پہنچ جاتا ہے لیکن یہ وہم بالکل پادر ہوا ہے اور اذنی تامل سے رفع ہو سکتا ہے کیونکہ خلیفہ وقت سے محاربہ کرنا معصیت ہے نہ کفر اور حدیث حربہ حدیث کفر پر دال نہیں چنانچہ شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی نے تحفہ اثنا عشریہ کے بارہویں باب میں شرح و بسط کے ساتھ اس پر بحث کی ہے۔ عوام صحابہ سے صدور معصیت کے گمان کرنے میں کسی قسم کا محذور شرعی لازم نہیں آتا۔ ولید بن عقبہ ابن ابی میط کا شارب خمر ہو کر حد شرعی کو پہنچنا کتب رجال سے ثابت ہے۔ عن ابی جعفر محمد بن علی جلد علی الولید بن عقبہ فی الخمر اربعین جلد ۱۔ (استیعاب و اسد الغابہ و اصابہ) یعنی امام ابو جعفر محمد باقر بن علی زین العابدین علیہ وآبائہ السلام سے مروی ہے کہ جناب امیر علیہ السلام نے ولید بن عقبہ کو شراب پینے پر چالینس ڈرے لگائے تھے۔ اسی طرح سے مسطح بن اثاثہ کا جناب صدیقہ کے افک میں کوشش کرنا اور قذف کی حد کو پہنچنا انھیں کتا بولنا

سے واضح ہے وکان ممن خاض فی الافک علی العائشۃ فجلدہ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (اسد الغابہ) یعنی مسطح بن اثاثہ ان لوگوں میں سے تھا جو جناب ام المومنین عائشہ کی نسبت بہتان کھڑا کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ پس آنحضرت صلعم نے اُس کو ڈرے لگوائے۔ ان امور سے ذیہ لوگ درجہ صحابیت سے ساقط ہو گئے اور زکا فر ہو گئے۔ اگر ہے تو صرف اس قدر کہ اُن سے خطا وقوع میں آئی، اور صدور معصیت سے آدمی کافر نہیں ہو سکتا۔ صحابیت کا شرف ایسا ہے کہ کسی معصیت سے بجز ارتداد کے زائل نہیں ہو سکتا۔

دوسرا وہم۔ چند اصحاب اس محاربہ میں امیر معاویہ کے شریک تھے، جب امیر معاویہ کے اس فعل کو خطائے منکر اور معصیت قرار دیا جائے تو اُن اصحاب کا امیر معاویہ کے ساتھ معصیت پر اتفاق کرنا لازم آئے گا اور آنحضرت صلعم کے صحابہ پر ایسا گمان فاسد ذیبا نہیں ہے۔

یہ وہم اکثر عدم تتبع کتب سیر اور احادیث کی وجہ سے ناشی ہوتا ہے اگر بہ نظر امعان کتب سیر اور رجال کو دیکھا جائے تو بجز عمرو بن العاص اور بشیر بن نعمان کے کوئی صحابہ اس امر میں امیر معاویہ کا شریک نظر نہیں آئے گا۔ اور یہ دو تین صاحب افاضل صحابہ میں شمار نہیں کیے جاتے حرب صفین میں تمام انصار و مہاجرین اور بدر میں جناب امیر علیہ السلام کے ربقہ اطاعت میں دکھائی دیتے ہیں، اگرچہ بعض اصحاب مثل عبداللہ بن عمر اور سعد بن ابی وقاص اس باہمی مقاتلہ سے کہ دین میں ایک امر جدید تھا اور وہ کفار سے جہاد کرنے کے جوگر ہو چکے تھے کنارہ گزین ہو گئے لہ اس سے قبل بھی ایسے واقعات قتل مالک بن جنگ جمل کے ہو چکے ہیں، یہ امر جدید نہیں ہے۔

تھے۔ لیکن ان کی کنارہ گزینی اس وجہ سے نہیں تھی کہ وہ جناب امیر کی خلافت میں شک و شبہ رکھتے تھے بلکہ انھیں بزرگوں سے اس کنارہ گزینی کے متعلق ان کی ہدایت اور جناب امیر کے ساتھ شرکت نہ کرنے پر حسرت ثابت ہے۔

اسد الغابہ میں علامہ ابن اثیر الجزری روایت کرتے ہیں، عن عبد اللہ

بن جبیب قال اخبرني قال قال ابن عمر حين حضره الموت ما احد في

نفسى من الدنيا الا لما قاتل الفضة الباغية يعنى عبد اللہ بن جبیب

اپنے والد سے ناقل ہے کہ جب عبد اللہ بن عمر کی وفات کا وقت قریب آگیا تو

کہنے لگے کہ میرے دل میں دنیا کی کوئی حسرت باقی نہیں رہی مگر یہ کہ میں باغی گروہ

سے نہیں لڑا۔ عن جبیب بن ابی ثابت عن بن عمر انه قال ما اتنى على

شيء الا انى لما قاتل مع على بن ابى طالب الفضة الباغية يعنى جبیب بن

ثابت کہتا ہے کہ عبد اللہ بن عمر کہا کرتے تھے کہ مجھے کسی بات کی حسرت باقی نہیں

رہی مگر یہ کہ جناب امیر کے ساتھ ہو کر میں باغیوں کے گروہ سے نہیں لڑا۔ عن

حيثمہ بن عبد الرحمن قال سمعت سعد بن مالك وقال له رجل ان عليا

يقع فيك انك تخلفت عنه فقال سعد والله انه لراى رايته واخطا۔

اخرجه الحاكم في المستدرک۔ (حيثمہ بن عبد الرحمن کہتا ہے کہ سعد بن مالک سے

کسی نے کہا کہ جناب امیر علیہ السلام اچھا نہیں کہتے کیونکہ تم نے ان کی بیعت سے

تخلف کیا ہے۔ وہ کہنے لگے یہ بھی ایک رائے تھی جو میں نے سوچی تھی، لیکن رائے

غلط نکلی،۔ اگرچہ بعض صحابہ بتقاضائے بشریت ابتدا میں جناب امیر سے کنارہ گزیں

تھے مگر عمار یا سر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے واقع ہونے سے ان کی مخالفت اور کنارہ گزینی

جاتی رہی تھی۔ قال الشعبي ما مات مسروق حتى تاب الى الله تعالى عن تخلفه مع علي (اسد الغابہ) یعنی شعبی کہتے ہیں کہ مسروق نہیں فوت ہوئے جب تک کہ انھوں نے خدا کی جناب میں جناب امیر سے جنگ میں مخالفت کرنے سے توبہ نہیں کی۔

تیسرا ہم۔ امیر معاویہ کی نسبت خطائے منکر تجویز کرنے سے الصحابة کلمہ عدول کا کلیہ ٹوٹتا ہے جس سے امور دین میں ایک بڑا بھاری تزلزل پیدا ہو جاتا ہے اور روایات کا سلسلہ درہم و برہم ہو جاتا ہے لیکن الصحابة کلمہ عدول سے محفوظون عن العاصی کسی نے مراد نہیں لیا، بلکہ عدل فی الروایۃ مراد لیا ہے۔ چنانچہ علامہ تاج الدین السبکی جمع الجوامع میں لکھتے ہیں والاکثر علی عدالة الصحابة وقيل كغيرهم وقيل الى قتل عثمان وقيل الامن قاتل عليا۔ یعنی اکثر علماء صحابہ کی عدالت کے قائل ہیں، بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ صحابہ بھی عدالت میں دوسروں جیسے ہیں۔ بعض نے یہ کہا کہ جناب عثمان کے قتل تک سب صحابہ عدول تھے اور بعض کہتے ہیں کہ سب صحابہ عدول ہیں مگر وہ لوگ جو جناب امیر سے لڑے ہیں وہ عدول نہیں۔ اس عبارت سے واضح ہوتا ہے کہ الصحابة کلمہ عدول سے صرف عدل فی الروایت مراد ہے اگرچہ اس میں بھی بعض ائمہ نے کلام کیا ہے۔

عبارت منذر جمة الصدرا جمع الجوامع کا متن ہے، علامہ جلال الدین محلی صاحب نے نصف آخر تفسیر جلالین میں جو اس کتاب پر شرح لکھی ہے جو شرح جمع الجوامع کے نام سے مشہور بین العلماء ہے اس کی عبارت کو ملاحظہ کیا چاہیے، وہ لکھتے ہیں:

”اکثر علمائے سلف و خلف عدالت صحابہ کے قائل ہیں کہ روایت

و شہادت میں ان کی عدالت سے بحث نہ کرنا چاہیے کیونکہ وہ تمام امت

سے بہتر ہیں۔ آنحضرتؐ نے فرمایا ہے تمام امت سے بہتر میرا زمانہ ہے۔ اس حدیث کو شیخین یعنی بخاری اور مسلم نے روایت کیا ہے اگر کسی صحابی سے کوئی فعل بد سرزد ہوا ہو تو اس کے موافق عمل کیا جائے۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ صحابہ بھی روایت اور شہادت میں مثل دیگر اشخاص کے ہیں ان کی عدالت سے بھی بحث کی جائے گی مگر وہ اصحاب جن کی عدالت ظاہر ہو مثل شیخین ابو بکر و عمر کے اور بعض علماء کا قول ہے کہ تمام صحابی جناب عثمان کی شہادت تک عدول تھے اور ان کے قتل کے بعد ان میں فتنہ واقع ہونے کی وجہ سے ان کی عدالت سے بحث کی جائے گی۔ بعض خویش کرنے سے ڈر کے ہوئے ہیں۔ بعض علماء کا مقولہ ہے کہ تمام صحابی عدول ہیں مگر جن لوگوں نے جناب امیر سے جنگ کی ہے پس وہ لوگ فاسق ہیں امام برحق پر خروج کرنے کی وجہ سے۔“

علامہ شہاب الدین بن احمد بن قاسم العبادی نے شرح جمع الجوامع پر ایک مبسوط حاشیہ لکھا ہے اور اُس کا نام آیات تیناں رکھا ہے، اس فقرہ ومن طرء له قادح کی توضیح میں لکھتے ہیں نبتہ بہ علی عدم عصمتہم یعنی صاحب تین نے اس مقولہ سے صحابہ کی عدم عصمت سے آگاہ کیا ہے۔

علامہ سعد الدین تفتازانی شرح مقاصد میں لکھتے ہیں:

”صحابہ سے جو محاربات و منازعات و قوع میں آئے وہ کتب تاریخ

میں درج ہیں اور ثقہ لوگوں کی زبانوں پر مذکور ہیں بظاہر اس امر پر دال ہیں کہ بعض صحابہ طریق حق سے تجاوز کر کے حد و فسق و ظلم کو پہنچ گئے

اور باعث اس کا کینہ، عناد اور حسد اور شدت، خصومت اور طلب ملک و ریاست و شہوات نفسانی کی طرف میلان تھا کیونکہ ہر صحابی معصوم اور ہر شخص کہ جس نے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ملاقات کی ہے نیکی کے ساتھ موسوم نہ تھا۔“

ان تمام مباحث سے ثابت ہوا کہ الصحابہ کلمہ عدول سے عدل فی الروایۃ مراد ہے نہ معصوم عن المعاصی اور صحابہ عدول فی الروایۃ اس لیے تسلیم ہوئے ہیں کہ جب علماء نے طبقات رجال میں تو انین جرح و تعدیل کو جاری کیا ہے تو صرف بہ نسبت دیگر طبقات کے صرف صحابہ ہی کا گروہ وضع احادیث سے بچتا ہوا پایا ہے۔

چوتھا وہم۔ اگر اس محاربہ کو معصیت قرار دیا جائے تو اہل شام جن میں بعض صحابہ بھی شریک تھے موعود بو عیدنا تصور کیے جائیں گے اور وعیدنا مستلزم کفر ہے لیکن وعیدنا بھی مستلزم کفر نہیں کیونکہ دوسرے معاصی مثل شرب خمر، زنا و سرقت وغیرہ کی سزا بھی دوزخ ہے جو توبہ اور شفاعت نبوی اور عفو ایزدی سے ٹل سکتا ہے۔ اسی طرح اہل صفین کی حفاظت کی نسبت بھی خیال کیا جا سکتا ہے کہ وہ توبہ سے یا آنحضرت صلعم کی شفاعت سے یا عفو باری سے ٹل جائے۔

پانچواں وہم۔ اگر جناب امیر علیہ السلام سے امیر معاویہ کے محاربہ کو معصیت قرار دیا جائے تو جناب عائشہ صدیقہ ام المؤمنین اور طلحہ و زبیر کے محاربہ کو بھی معصیت قرار دینا پڑے گا۔ یہ وہم بھی عدم تتبع کتب سیر و تواریخ سے ناشی ہوتا ہے اس کا جواب بچند وجوہ دیا جا سکتا ہے:

(الف) اصحابِ جمل کی غرض امیر معاویہ کی غرض سے بالکل متباہن تھی جس کی تفصیل ہم پیشتر کر چکے ہیں۔ اصحابِ جمل میں سے کسی صاحب نے خلافت کا دعویٰ نہیں کیا، اس لیے بعض علماء نے ان کے باغی قرار دینے میں تاہل کیا ہے اور امیر معاویہ کو باغی اول قرار دیا ہے۔ شرح مقاصد میں علامہ تفتازانی لکھتے ہیں ذہب الکثیرون الی ان اول من بغی فی الاسلام معاویہ یعنی اکثر علماء کا یہ مسلک ہے کہ جس شخص نے اسلام میں سب سے اول بغاوت کی ہے وہ معاویہ ہیں۔

(ب) تمام کتب سیر و تواریخ بہ آواز بلند پکار رہے ہیں کہ اصحابِ جمل میں سے کسی صاحب نے بالارادہ جناب امیر علیہ السلام سے جنگ نہیں کی، بلکہ جب قاتلانِ عثمان کی فتنہ پردازی سے رات کو لڑائی شروع ہو گئی تو ناچار صحابہ جمل دفاع پر یعنی حفاظت خود اختیار کی کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

قال العلامة سعد الملة والدين التفتازانی فی شرح المقاصد والمحققون من اصحابنا رحمهم ان الحرب الجمل كانت فلتة لا من قصد من الفريقين بل كانت تمهيجا من قتلة عثمان حين صاروا فرقتين واختلطوا بالعسكرين واقاموا الحرب خوفا من القصاص وقصد عائشة لم يكن الا اصلاح الطائفتين وتسكين الفتنة فوعدت في الحرب۔ یعنی ہمارے محقق اصحاب اس بات کے قائل ہیں کہ حربِ جمل بلا قصد فریقین ناگہانی طور پر واقع ہو گیا۔ حضرت عثمان کے قاتلوں کی انگریز تھی کہ وہ لوگ دو گروہ بن کر دونوں لشکروں پر جا پڑے اور قصاص کے خوف سے فتنہ اٹھار یا۔ جناب ام المومنین عائشہ کا قصد دونوں

گروہ میں صلح کرانے اور فتنہ فرو کرنے کے سوا اور کچھ نہیں تھا لیکن لڑائی میں بھنسن گئیں۔  
 (ج) اصحاب جمل میں سے کوئی خلیفہ وقت سے انتزاع خلافت کا صدمہ نہیں  
 ہوا اور نہ کوئی جناب امیر کی مخالفت پر مصر ہو کر قتل ہوا ہے۔ چنانچہ لڑائی کی رات کو  
 جب ظلمت شب مرتفع ہو گئی اور صبح نمودار ہوئی اور جناب طلحہ پر حقیقت حال کا انکشاف  
 ہو گیا فوراً محاربہ سے کنارہ کش ہو گئے اور مروان بن حکم کے ہاتھ سے تیرکھا کر شہادت  
 نوش کیا۔

علامہ ابن عبدالبر استیعاب میں فرماتے ہیں:

”اکثر اہل علم کہتے ہیں کہ جناب امیر نے طلحہ کو بلا کر اپنی سابقت اور  
 فضل کو بیان کیا۔ طلحہ لڑائی سے واپس ہو کر زبیر کی طرح سے فوج کی صفوں  
 سے علیحدہ ہو گئے، مروان بن حکم نے تیر مار کر شہید کیا اور علماء ثقات میں  
 سے کسی نے اختلاف نہیں کیا کہ طلحہ کو اسی دن مروان نے قتل کیا ہے، اور  
 مروان حضرت طلحہ کے گروہ میں سے تھا“

عن یحییٰ بن سعید قال قال طلحة یوم الجمل :

ندمت ندامة الکسعی لسا

شریت رضی اللہ عنی جرم برغمی

اللہم خذ منی لعثمان حتی ترضی فرماہ مروان سہم فی رکتہ۔ (اخرجہ

لے واقعات سے بالکل آنکھ بند کر کے یہ کہا جا سکتا ہے ورنہ راہ مکہ سے روانگی اور لوگوں کو  
 خط لکھنا وغیرہ عملاً حضرت سے جنگ کے لیے تقاضا کر رفع فتنہ

ابو عمرو صاحب الاستیعاب وابن الاثیر فی اسد الغابۃ وحب الطبری فی  
الریاض، جناب طلحہ کا تجدید بیعت کرنا بھی ثابت ہے چنانچہ شیخ عبدالحق محدث  
دہلوی "مدارج النبوة" میں تحریر فرماتے ہیں:

"از ثور بن حجر آمدہ کہ گفت گزشتم بطلمو بن عبد اللہ یوم الجمل دوی  
افتادہ بود بر زمین در آخر رقی پس ایستادم بروے و برداشت سر خود را  
و گفت بدستی ہر آئینہ می بینم روے مروے را کہ گویا قر است بگو گیتی  
گفت از اصحاب امیر المؤمنین علی گفت فراخ کن دست خود را تا بیعت  
کنم ترا۔ پس گفت اللہ اکبر اللہ اکبر صدق رسول اللہ صلعم یاد کرد خدا تعالی  
کہ دارد طلحہ را در بہشت مگر آنکہ بیعت من گردن او باشد۔"

اور جناب زبیر کی نسبت تمام کتب تواریخ بر آواز بلند شہادت دیتے ہیں کہ جب  
معرکہ کارزار گرم ہوا جناب امیر نے ان کو بلا کر تنبیہ کیا، وہ فوراً اصحاب جمل کا  
ساتھ چھوڑ کر مدینہ کو چلے گئے اور وادی سباح میں پہنچ کر عمرو بن جرموز کے ہاتھ  
سے شہید ہو گئے۔

قال ابن عبد البر فی الاستیعاب ثم شهد الذبیر بمجمل  
فقاتل فیہ ساعة فناداه علی والفر دبه فذكرة ان رسول الله  
صلعم قال له وقد وجدها يضحك ان بعضا اما انك  
ستقاتل عليا وانت له ظالم فذكر خالك للزبير فانصرف عن  
القتال نادما مفارقا للجماعة التي خرج فيها منصرفا الى المدينة  
فاتبعه ابن جرموز فقتله بموضع يعرف بوادي السباع وجاء بسيفه

انی علی فقال بشر قاتل بن صفیة بالنار۔ یعنی پھر زبیر فوج سے باہر نکل کر حملہ آور ہوئے، تھوڑی دیر تک لڑتے رہے۔ پھر جناب امیر نے اُن کو بلایا اور تنہائی میں اُن سے جناب رسالت مآب کا ارشاد یاد دلایا کہ تم نے ہم دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ ہنستے ہوئے پا کر پوچھا تھا اور حضرت نے فرمایا تھا کہ تم عنقریب علی سے لڑو گے اور تم ان پر ظلم کرو گے۔ جب جناب امیر نے اُن سے اس کا تذکرہ بیان کیا۔ وہ لڑائی سے ناام ہو کر مدینہ طیبہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ ابن جریر نے ان کا پچھا کیا اور وادی سباع میں ان کو شہید کیا اور اُن کی تلوار لے کر جناب امیر کے پاس حاضر ہوا۔ جناب امیر نے فرمایا ابن صفیہ کے قاتل کو دوزخ کی خوش خبری ہو۔

### تنبیہ:

صفیہ بنت عبدالمطلب جناب زبیر کی والدہ، جناب امیر کی چھوٹی تھیں اور زبیر آنحضرت صلعم اور جناب امیر کے عم زاد بھائی تھے۔ اسی لیے جناب امیر علیہ السلام فرمایا کرتے تھے اخواننا بغونا یعنی ہم پر ہمارے بھائیوں نے بناوت کی ہے۔ اسی طرح سے جناب صدیق کا نام ہونا تمام کتب سیر و رجال سے ظاہر ہے۔ ابوالبرکات عبداللہ بن احمد بن محمود النسفی الاعتقاد فی الاعتقاد میں لکھتے ہیں:

وكداعائشة ندمت علی ما فعلت و كانت تبکی حتی تبل خمارها

لے مگر علی کا ساتھ نہ دیا۔

لے اوپر تفتازانی صاحب کی عبارت اول من بغی فی الاسلام معاویہ سے استدلال میں بناوت معاویہ ثابت ہوئی لیکن علی کے بغونا کہنے سے کچھ ثابت نہ ہوا۔ سبحان اللہ!

شرح فقہ اکبر للامام علی القاری یعنی اس طرح سے جناب صدیقہ اظہارِ مذمت فرماتی رہیں اور یہاں تک رویا کرتی تھیں کہ اُن کے سر کی اور ٹھنی تر ہو جاتی تھی۔ عن جابر قال دخلت علی عائشہ یومًا وقلت لہا ما تقولین فی علی فاطرقت رأسہا ثم رفعت وقالت :

اذا ما التبرحک علی محک تبین غشہ من غیر شک  
وفینا الغش والذهب المصفی علی بینا شبہ المحک

اخرجه الشيخ حافظ الزرندي في در السعطين۔

یہ ایسے واقعات ہیں جن سے کسی نے انکار نہیں کیا کیونکہ کہا جاسکتا ہے کہ امیر معاویہ کا حرب صفین جس کا منظر ایک مدت مدید تک جاری رہا اور جنگِ جبل جس کا خاتمہ ایک ہی روز میں ہو گیا برابر ہے اور جس طرح امیر معاویہ مورداً اعتراض ہیں اسی طرح سے اصحابِ جبل بھی ہیں جن کی براہِ خود جناب امیر سے مروی ہے۔ علامہ ابن عبدالبر استیعاب میں لکھتے ہیں :

من قد روى عن علي قال والله لا رجوان اكون انا وعثمان وطلحة

والزبير ممن قال تبارك وتعالى ونزعنا ما في صدورهم من غل اخوانا علی سرور متقابلین۔ یعنی جناب امیر علیہ السلام سے منقول ہے کہ فرماتے تھے کہ خدا کی قسم ہے میں امید کرتا ہوں کہ میں اور عثمان اور طلحہ اور زبیر اُن میں سے ہوں جن کی نسبت خدا نے فرمایا ہے اور نکال ڈالی ہم نے جو اُن کے جیبوں میں تھی، خفگی بجائی ہو گئے تختوں پر بیٹھے آمنے سامنے یہ جلیل القدر صحابہ اہل الخواص مہاجر عشرہ مبشرہ میں سے ہیں اور جناب رسول اللہ صلعم کے حواری کہلائے جاتے

ہیں، ان کے فضائل و مناقب متواترات کی حد تک پہنچ چکی ہیں اور جناب امیر کے ہم پلہ خیال کیے جاتے ہیں۔ اس کے ماسوا خود جناب امیر نے ان کی برادرت کی شہادت دی ہے۔ باوجود ان حالات کے پس کیوں کر ان کی ذوات مقدسہ سے صدور معصیت کا گمان کیا جاسکتا ہے البتہ ان کا جناب امیر پر خروج کرنا یا نکت بیعت کرنا تو ثابت ہے جس کو خطا فی الاجتہاد سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی مدارج النبوة میں لکھتے ہیں: ”و بود طلحہ روز جمل با عائشہ بہ جہت خطا در اجتہاد“۔

لیکن جس طرح سے ان کا خروج ظاہر ثابت ہے اسی سے ان کی توبہ اور زندامت اور رجوع بھی ثابت ہے۔ برخلاف ان امور کے معاویہ بقولے پانچ سال اور قبول ارسال جناب امیر سے جنگ کرتے رہے اور اپنی خطا پر مصر رہے۔ چنانچہ ابن عبد البر استیعاب میں لکھتے ہیں:

فحارب معاویة علیا خمس سنین وقال ابو عمرو ووصا بہ اربع سنین۔ یعنی جناب امیر علیہ السلام سے امیر معاویہ پانچ سال تک لڑتے رہے۔ ابو عمرو کہتے ہیں ٹھیک بات یہ ہے کہ چار سال تک لڑتے رہے بلکہ مخالفت ہی پر مصر نہیں رہے۔ تسخیر بلاد اور دعوی خلافت کو منظور نظر رکھ کر امیر علیہ السلام کی دشمنی کی وجہ سے کبیر الروم کو نذر دے کر صلح کر لی۔ اگر معاویہ کو استنزاع خلافت مد نظر نہیں تھا تو محمد بن ابی بکر جناب امیر علیہ السلام کے عامل سے مصر کو کیوں چھین لیا تھا۔ بعض لوگ بمقابلہ جناب امیر علیہ السلام کے امیر معاویہ کے فضائل و مناقب بیان کرتے ہیں اور ان کے مناقب اصحاب جمل کے مناقب کے ہم پلہ ٹھہرائے جاتے ہیں، لیکن اصحاب جمل کے مناقب مشتبہ اور امیر معاویہ کے مناقب غیر مشتبہ میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

حضرت اُمّ المؤمنین کی عفت پر قرآن ناطق ہے، حضرت طلحہ و زبیر کے فضائل متواترات سے سُنم اور ثبوت ہیں۔ امیر معاویہ کے فضائل و مناقب کا یہ حال ہے کہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی مدارج النبوة میں لکھتے ہیں: ”وگفتہ اند محمد شان ثابِت زُشَدہ در فضل معاویہ، بیج حدیثے“۔

امام ابو عبد الرحمن بن شعیب النسائی فرماتے ہیں: ”ما اعرف له فضیلة الا لاشبع الله بطنه“ یعنی امیر معاویہ کی فضیلت بجز اس کے نہیں جانتا کہ حضرت نے فرمایا ہے ”خدا اس کے پیٹ کو نہ بھرے“۔ دوسرے مقام پر مقولہ اما یر فی معویة ان ینخرج رأس برأس زبان پر لاتے ہیں، یعنی معاویہ اس پر راضی نہیں کہ سر بسر نجات پا جائے۔

قال محمد بن اسحاق الاصمہانی سمعت مشایخنا عصر یقولون ان ابا عبد الرحمن النسائی فارق مصر فی آخر عمرہ وخرج الی دمشق فسئل عن معویہ وماروی من فضله فقال اما یرضی معویہ ان ینخرج رأس برأس حتی یفضل و فی روایة ما اعرف له فضیلة الا لاشبع الله بطنه۔ (وفیات الاعیان لابن خلکان و مرآة الجنان للامام عبد اللہ الیافعی، محمد بن اسحاق اصمہانی کہتے ہیں کہ میں نے اپنے مشایخوں کی زبان سے سُنا ہے کہ امام ابو عبد الرحمن النسائی اپنی آخر عمر میں مصر کو چھوڑ کر دمشق چلے گئے، وہاں کے لوگوں نے امیر معاویہ کے فضائل و مناقب کی نسبت پوچھا۔ امام نسائی نے جواب دیا کہ امیر معاویہ اس بات پر راضی نہیں ہوتے کہ وہ نجات ہی پا جائیں کہ اُن کے فضائل کو بیان کیا جائے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ امام نسائی

نے فرمایا مجھے اُن کی کوئی فضیلت معلوم نہیں سوائے اس کے کہ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ خدا اس کے پیٹ کو نہ بھرے۔

عن ابن عباس رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ صلعم بعث لمعاویة لیکتب فقیل له انه یا کل فقال صلعم لا اشبع اللہ بطنه (اخرجه ابوداؤد الطیالسی) ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ جناب رسالت مآب نے ایک آدمی کو معاویہ کے بلانے کے لیے بھیجا، وہ اگر کہنے لگا وہ کھانا کھا رہے ہیں۔ حضرت نے فرمایا خدا اس کے پیٹ کو نہ بھرے۔

بعض اشخاص ان کی فضیلت یہ بیان کرتے ہیں کہ وہ کاتب الوحی تھے۔ خیال کرنا چاہیے کہ اگر کتابت وحی سے کسی قسم کی فضیلت ثابت ہوتی ہے تو وہ مروان بن الحکم کے لیے بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن امیر معاویہ کے کاتب الوحی ہونے میں محدثین کا اختلاف ہے۔ چنانچہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی مدارج النبوة میں لکھتے ہیں:

”واما معاویہ بن ابی سفیان کینت کردہ می شود بانی عبد الرحمن یکے ازاں جملہ است کہ می نوشت برائے آنحضرت صلعم و بعضے گویند نوشت وحی صاحب جامع الاصول می گوید کتابت نشدہ است در مواہب لدنیہ می گوید و سے مشہور است بر کتابت و بعضے گویند و سے نمی نوشت وحی را بلکہ می نوشت کتب و مناشرایا“

ماسوائے اس کے جناب عثمان کی فضیلت زیادہ تر جامع القرآن ہونے کی وجہ سے ہے جس کا ثواب ان کو تابروز قیامت ہوتا رہے گا اور جس قدر کہ دنیا میں لوگ قرآن شریف پڑھنے والے ہیں یا ہوتے چلے آئے ہیں یا ہوتے رہیں گے

ان کے پڑھنے کا ثواب حضرت عثمان جامع القرآن کے نامہ اعمال میں ثبت ہوتا ہے گا۔  
چھٹا وہم۔ اگر امیر معاویہ عاصی اور باغی ہوتے تو جناب امام حسن مجتبیٰ علیہ النجیۃ  
والنثار کیوں خلافت اُن کے سپرد فرماتے۔

لیکن یہ وہم بھی بالکل بے جا ہے کیونکہ امامت عامہ کی تفویض ایسے شخص کے  
ہاتھ میں کرنے سے جو پیشتر باغی رہ چکا ہو اور پھر تائب ہو کر کتاب و سنت اور سیرت شریفین  
کے اتباع کا عہد کرتا ہو کوئی اعتراض جناب امام حسن علیہ السلام کے غلام کی طرف  
عامد نہیں ہو سکتا۔ جناب امام نے جو عہد کر معاویہ سے تفویض امارت کے وقت کیا ہے  
وہ سابقہ اعمال سے بمنزلہ توبہ کے تصور کیا جاسکتا ہے لیکن جناب امام کی امارت عامہ  
تفویض کرنے سے امیر معاویہ کا سابقہ امور میں محفوظ عن الخطا ہونا کسی طرح سے ثابت  
نہیں ہوتا۔ اس کی ٹھیک مثال ایسی ہے کہ ایک گاؤں کے مالک نے غلہ کا انبار مساکین  
پر خیرات کرنے کے لیے جمع کیا ہو، ایک رہزنیوں کا سردار اُسے غارت کرنا چاہے،  
مالک اس کی حفاظت کے واسطے اس سے جنگ کرے، پھر ایک مدت کے بعد مالک  
فوت ہو جائے اور اُس کا بیٹا اُن رہزنیوں کے سردار سے یہ عہد لے کر وہ غلہ کا انبار  
اُس کے سپرد کر دے کہ یہ غلہ ہم اس شرط سے تمہارے سپرد کرتے ہیں کہ تم مساکین پر  
صرف کیا کرو اور اس میں خیانت نہ کرو، اور اس تفویض سے فتنہ و فساد فرو ہو جائے،  
اور نحوں ریزی مٹ جائے تو اُس سے نہ اُس غلہ کے مالک کی نسبت جو ان غارتگریوں  
سے حفاظت غلہ کے لیے جنگ کرتا تھا کوئی اعتراض وارد ہو سکتا ہے اور نہ اُس مالک  
کے بیٹے پر جس نے یہ عہد لے کر غلہ اُن رہزنیوں کے سپرد کیا ہے اور غلہ کی حفاظت  
سے نہ اپنا ہی پیچھا چھڑایا ہے بلکہ ایک خلق خدا کو ناحق کے کشت و خون سے بچایا ہے

اور نہ ان رہزنوں کا افسر جس زمانہ تک کہ غلہ اس کی تفویض نہیں ہوا تھا اور وہ اس میں تصرف کرنا چاہتا تھا اعتراض سے بچ سکتا ہے۔ البتہ اگر اس عہد کے بعد وہ اپنے قول و فعل میں صادق نکلے اور غلہ کو عہد کے موافق ماسکین پر صرف کرتا رہے تو خیال کیا جائے گا کہ اُس نے اپنے اعمال سابقہ سے توبہ کی ہے اور اب اس کو غلہ میں تصرف کرنا جائز ہو گیا ہے۔ اگر پھر وہ راہزن یا اس کا جانشین عہد سے انحراف کر کے شرائط کو پورا نہ کرے تو پھر عاصی تصور ہوگا اور اس کے ساتھ اس عہد گیر نہ یا اس کے جانشین پر جہاد واجب ہو جائے گا۔ چنانچہ اسی بنا پر جناب امام حسین علیہ السلام نے امیر معاویہ کے جانشین یزید پلید کو جب وہ شرب خمر کرنے لگا اور حقوق الناس میں اور حدود اللہ سے تجاوز کر کے بہن اور بھائی کی شادی کا مجوز ٹھہرنے لگا تو متنبہ کرنا چاہا تھا اور حضرت امام علیہ السلام اس خروج میں محق تھے۔ کیونکہ خلافت دراصل انھیں کا حق تھا۔

ساتواں وہم۔ جب امام حسن علیہ السلام خلافت کو ترک کرنا چاہتے تھے تو امیر معاویہ کو تفویض خلافت کے لیے کیوں منتخب کیا تھا اور خلافت کسی دوسرے کو کیوں نہیں سپرد فرمائی تھی۔ جناب امام کے اس انتخاب سے یہ نتیجہ پیدا ہوتا ہے کہ امیر معاویہ اپنے عہد میں افاضل صحابہ میں سے ہوں گے جن کی وجہ سے جناب امام نے خلافت اُن کے سپرد فرمائی، ورنہ حضرت امام کسی دوسرے کو اس منصب کے لیے منتخب فرماتے۔

یہ وہم بھی عدم متبع کتب سیر و تواریخ سے ناشی ہوتا ہے کیونکہ جناب امام حسن نے خلع خلافت کے وقت امیر معاویہ کو امارت عائدہ اس وجہ سے سپرد فرمائی تھی، اور

دوسرے کو اس لیے منتخب نہیں کیا تھا کہ بغیر اس کے خون ریزی کا اندادو محال تھا۔ اگر جناب امام حسنؑ کسی اور صحابی کو امارت سپرد فرماتے تو ضرور امیر معاویہ ان سے وہی معاملہ کرتے جو جناب امیر علیہ السلام سے کیا تھا۔ اس کے علاوہ خلافت راشدہ کا زمانہ منقض ہو چکا تھا اب مملکت عضوہ کی عہد کی صبح نمودار ہونے والی تھی بجز امیر معاویہ کے اور کوئی صحابی اس کو پسند نہیں کرتا تھا۔ بھوٹے اعطایا القوس بارہا جناب امام نے امیر معاویہ ہی کو اس منصب کے لیے لائق سمجھا اور جس امر کے لیے وہ برسوں سے کشت و خون کر رہے تھے ان کے حسب منشا انھیں سپرد کیا۔ اب رہا یہ امر کہ معاویہ تفویض امارت کے بعد بھی امام ہوئے ان کی نسبت اہلسنت والجماعت میں باہم اختلاف ہے۔ قرآن اسلام حسن بزوری لکھتے ہیں:

اما بعد موت علی ہل صار اماما وقال بعضهم لم یصر اماما انه لم یکن افضل الصحابة بعد علی بل کان من الصحابة یومئذ هو افضل منه بکثیر فی النسب والعلم والتقوی والشجاعة ولان احدا من الصحابة لم یراه امام حق ولم یعقد له عقد الامامة ومعویة ما کان من جملة المخلفاء ولكن کان من جملة الملوح۔ یعنی جناب امیر علیہ السلام کی وفات کے بعد بھی امیر معاویہ امام ہوئے ہیں یا نہیں؟ بعض اہلسنت والجماعت کہتے ہیں کہ نہیں ہوئے۔ لیکن ان لوگوں کے قول کی وجہ کہ جو کہتے ہیں کہ امام نہیں ہوئے یہ ہے کہ امیر معاویہ جناب امیر علیہ السلام کی وفات کے

لے یہ عجیب بات ہے کہ جب علیؑ کی افضلیت یا امام کا افضل ناس ہونا پیش کیا جاتا ہے تو وہاں اجماع یا شوریٰ کو دیکھنا ہے۔ یہاں پر امارت کی صلاحیت نہ ہونے کا سبب منقولیت قرار دیا جاتا ہے۔

بعد اُس وقت کے موجودہ اصحاب سے افضل نہیں تھے بلکہ اُس وقت اکثر ایسے اصحاب موجود تھے جو نسب اور علم اور شجاعت اور تقویٰ میں امیر معاویہ سے بدرجہا افضل تھے اور امیر معاویہ خلفاء میں سے نہیں تھے بلکہ بادشاہوں میں سے تھے۔ اسی لیے کسی صحابی نے ان کو امام نہیں روایت کیا اور ان پر امامت کا عقد نہیں ہوا۔ اسی واسطے اہل علم امیر معاویہ کو خلفاء میں سے نہیں شمار کرتے بلکہ ملوک میں سمجھتے چلے آئے ہیں۔ تاریخ الخلفاء میں علامہ جلال الدین السیوطی ابن ابی شیبہ کی کتاب مصنف سے نقل کرتے ہیں :

عن سعید بن جبہ ان قال قلت لسفينة ان بنی امیة یزعمون ان الخلافة منهم قال کذب بنوا الزرقاء بل هم ملوک اشد الملوک واول الملوک معاویة۔ یعنی سعید بن جبہ ان کہتے ہیں میں نے سفینہ سے پوچھا کہ بنی امیہ اپنے آپ کو خلفاء جانتے ہیں۔ وہ کہنے لگے کہ یہ گنجی عورت کے جنے جھوٹ بکتے ہیں یہ لوگ سخت ترین بادشاہوں میں سے ہیں اور ان میں سے پہلا بادشاہ معاویہ ہے۔

فخر الاسلام بزدوی المیسر میں لکھتے ہیں :

ومعاویة ماکان من جملة الخلفاء ولكن کان من جملة الملوک علی ماروینا عن النبی صلعم انه قال الخلافة بعدی ثلاثون سنة ثم بعدا ملک عضوض وقد تم ثلاثون سنة بعلی۔ یعنی معاویہ خلفاء میں سے نہیں تھے بلکہ ملوک میں سے تھے بدلیل اس حدیث کے کہ جناب رسولؐ نے فرمایا ہے کہ خلافت میرے بعد تیس برس تک

رہے گی، پھر ایک درندہ شاہی ہوگی اور تیس برس جناب امیر علیہ السلام تک پورے ہو چکے تھے۔

آٹھواں وہم۔ سواد اعظم اہل سنت والجماعت نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ امیر معاویہ کی خطا، خطافی الاجتہاد ہے اور وہ اس میں معذور بلکہ ماجور اور شاب تھے۔ اس کے برخلاف خطائے منکر کا قائل ہونا اور ان کو باغی اور عاصی قرار دینا خارق سواد اعظم بنا ہے اور من شذ شذ فی النار کے زمرہ میں داخل ہونا ہے۔ یہ ایک بڑی بھاری دلیل ہے جو اہل صفین کی براہت پر پیش کی جاتی ہے لیکن اس میں بوجہ متعددہ نظر ہے۔ اگر غور کیا جائے تو یہی دلیل امیر معاویہ اور ان کے متبعین پر منقلب ہوتی ہے کیونکہ جناب امیر علیہ السلام کی خلافت کا انعقاد اہل حل و عقد کے اتفاق سے ہوا ہے اور جناب امیر نے اہل صفین کے مقابلہ میں اسی دلیل کو پیش بھی کیا تھا۔ امیر معاویہ کی شرکت میں چند صحابہ جن کی تعداد جمع قلت سے تجاوز نہیں کرتی۔ اہل شام کے نو مسلمانوں کی جمعیت کے ساتھ جن کے امور دین میں ماہر ہونے کی نسبت مسعودی علیہ الرحمہ نے مروج الذهب میں ایک مضحکہ کی حکایت لکھی ہے:

”اہل علم بھائیوں میں سے ایک شخص ذکر کرتا ہے کہ ہم دمشق الشام میں

جناب امیر علیہ السلام اور امیر معاویہ کی نسبت بحث کیا کرتے تھے عوام الناس

شامی ہماری گفتگو سنا کرتے تھے۔ ایک روز ان میں سے ایک لانی ڈاڑھی

والاجوان میں نہایت عقلمند سمجھا جاتا تھا اگر ہم سے کہنے لگا کب تک تم علی اور

معاویہ کے جھگڑے کو طول دو گے۔ میں نے کہا تیری اس میں کیا رائے ہے؟

کہنے لگا تو کس کی نسبت پوچھتا ہے؟ میں نے کہا علی کی نسبت۔ کہنے لگا وہی

علیؑ جو فاطمہؑ کے باپ تھے۔ میں نے کہا فاطمہؑ کون تھیں؟ کہنے لگا حضرت صلعم کی بی بی عائشہ کی بیٹی معاویہ کی بہن۔ میں نے کہا اچھا یہ تو بتا کہ علیؑ کا کیا قصہ ہے؟ وہ بولا غزوہ حنین میں آنحضرتؐ کے ساتھ جنگ کیا تھا؟

اس سواد اعظم کے خارق تصور نہیں کیے جاتے کہ جس پر تمام افاضل صحابہ اور مہاجرین و انصار اہل حل و عقد کا اجماع ہو چکا تھا۔ پس وہ اہل سنت و الجماعت کا گروہ جو امیر معاویہ کے خطائے منکر کے قائل ہیں کیونکہ سواد اعظم کے خارق تصور کیے جا سکتے ہیں، جب کہ اہل صفین کے دامن پر صحابہ کرام اہلبیت عظام و انصار مدینہ کے سواد اعظم (کہ محققین اہل سنت کے نزدیک اجماع دراصل انہیں کے اتفاق رائے سے مراد ہے) کی مخالفت سے کسی قسم کا وہبہ نہیں لگتا۔ پس اگر کوئی شخص بعض کتب مشہورہ کے برخلاف اہل صفین کی معذوری کو نہ تسلیم کرے اور بقول مولانا جامی:

اختلافیہ کہ داشت با جیدر در خلافت صحابی دیگر  
حق در آنجا بدست جیدر بود جنگ با او خطائے منکر بود

کا قائل ہو تو اس کو کیوں خارق اجماع کہا جا سکتا ہے۔

(ب) یہ حجت خطابیات کی قسم سے ہے نہ برہانیات سے، ایسے دلائل اقناعیات پر اکتفا کر لینا اتیان حجت سے عجز کی دلیل ہے اس سے مخالفین کی زبان طعنہ کشادہ ہوتی ہے۔ اہلسنت و الجماعت کے مخالف کہہ سکتے ہیں کہ جب ان لوگوں کے ایسے دعوے بے دلیل اور امر خلاف ہدایت پر اتفاق کر لیا ہے تو ان کے دوسرے دلائل اور مقدمات مسئلہ بھی اسی قبیل سے ہوں گے۔ اگر اتباع سواد اعظم سے مراد صرف اتباع کثرت آراء ہے تو یہ بات ہرگز قابل تسلیم نہیں ورنہ حنبلی المذہب جن کی جماعت

بمقابلہ اصناف کے نہایت قلت کے ساتھ اسلامی دنیا میں آباد ہے۔ من شد  
 شد فی النار کے مورد سمجھے جائیں گے۔ سواد اعظم سے اجماع امت مراد ہے۔  
 اس بحث میں چند علماء کے اقوال نقل کرنے سے اجماع ثابت نہیں ہوتا، بلکہ اگر  
 تلاش کیا جائے تو صحابہ کی جماعت سے کسی صاحب کا پتہ نہیں ملتا کہ اس اہل صفین  
 کی برات پر کسی قسم کا اشارہ بھی کیا ہو بلکہ جناب امیر کے ساتھ سب صحابہ کرام کی  
 شرکت اور اہل صفین کے مقاتلہ کرنے سے بھی متبادر ہوتا ہے کہ سب بزرگوار  
 خلیفہ وقت کے ساتھ ان کی مخالفت کو بغاوت اور اس بغاوت کو عیان سمجھتے  
 تھے اور ان کے ساتھ جنگ کرنا واجب جانتے تھے۔ اس کے ماسوا حضرت عمار  
 یا سر کی شہادت نے ان کو مخبر صادق صلعم کا قول یا عمار تفتلک الفعۃ  
 الباغیۃ یاد دلایا تھا۔ جس سے یقیناً وہ اہل صفین کو حاظی، باغی، عاصی سمجھتے  
 تھے اور ان کو ایسا سمجھنے میں بمعیت امام وقت انھوں نے اجماع کر لیا تھا اور  
 ان کا اجماع تفتلک الفعۃ الباغیۃ سے منصوص تھا۔

(اقول) صاحب ارجح المطالب کی عبارت کو عربی، فارسی، اردو و لفظ  
 بہ لفظ باوجود طویل ہونے کے اس لیے نقل کر دیا گیا کہ اس میں امام حسن علیہ السلام  
 کی صلح کی تحین و توجیہ کے علاوہ دیگر فوائد بھی ہیں علی الخصوص معاویہ کے اعمال  
 و افعال پر اور ان سے جس طرح اور جن وجوہ سے اہل سنت علماء کو اشتباہ میں  
 دانستہ یا نادانستہ واقع ہو جانا پڑا ہے کافی روشنی پڑتی ہے اور جو لوگ یزید اور  
 معاویہ میں فرق نہیں کر کے امام حسن علیہ السلام کے لیے بھی امام حسین علیہ السلام کی  
 طرح جنگ کرنا یکساں سمجھتے ہیں ان کا جواب خود بخود ہو جاتا ہے۔ غور کیجئے امام حسن

کو ایسی پالیسی والے شخص سے سابقہ پڑا ہے جس کے لیے صاحب ارجح المطالب باوجود غلطی اور بغاوت وغیرہ ثابت کرنے کے الفاظ بد کے استعمال کو ممنوع قرار دیتے اور اُس کے لیے الفاظ تعظیمی استعمال کرتے ہیں۔ توجہ معادیر کو صحت پر اور معذور و ماجور کہتے ہیں ان کا تو ذکر ہی کیا۔ بخلاف اس کے امام حسین کا مقابلہ اُس پالیسی کے شخص سے ہوا تھا جسے کوئی آدمی کہنے کو تیار نہیں۔ اپنی اس طویل عبارت کے نیچے صاحب ارجح المطالب نے بعنوان "احادیث متعلق شہادت عمار یا سر رضی اللہ عنہ" سترہ روایتیں نقل کر کے لکھے ہیں:

قال الامام ابوالمعالی فی الارشاد حدیث تقتلک الفئة الباغية  
هو من اثبت الاخبار الامام ابوالمعالی کتاب ارشاد میں لکھتے ہیں کہ حدیث تقتلک  
الفئة الباغية نہایت ثابت شدہ احادیث میں سے ہے۔

صاحب ارجح المطالب کی عبارت منقولہ میں شیوہ نقطہ نگاہ سے بے شمار قابل مواخذہ مقامات ہیں، بعض جگہ ہلکا سا تعرض بھی کر دیا گیا ہے پھر بھی بہت سے قابل اعتراض امور باقی رہ گئے ہیں۔ چونکہ مقصود صرف اپنی تائید میں مخالف کی رائے پیش کرنا تھا اس لیے سب کو نقل کر دیا ہے۔ اب اس حد تک پہنچ کر مجھے کامل یقین ہے کہ کسی شیعہ کو بحیثیت شیعہ ہونے کے امام حسن علیہ السلام کی صلح کے متعلق کوئی شبہ باقی نہ رہ سکے گا۔ کیونکہ شیعوں کے علاوہ اہل سنت کی کتابوں سے بھی وجوہ و حالات پر کافی روشنی پڑ چکی جس سے امام حسن کی روش پر کوئی اعتراض نہیں پڑ سکتا، اور جب اہل سنت اور خصوصاً وہ جو باوجود اسلام و مسلمین کے ساتھ اُس سلوک کے جس کا ذکر ہوا اور امام حسن کے ساتھ باوجود اُس سلوک کے جس کا ذکر ہوا امام حسن کی صلح

کو صحیح اور ان کی اس روش کو درست اور ناقابل اعتراض سمجھتے ہیں تو شیعوں کو اعتراض کی تو کوئی وجہ ہی نہیں ہو سکتی۔

یہاں سے اب کتاب کا دوسرا جزو شروع ہوتا ہے یعنی غیر شیعہ مسلمان کے نزدیک بھی یہی صحیح اور درست تھا جو امام حسنؑ نے کیا، یعنی آپ کو جنگ روک دینا ہی درست تھا اور صلح کرنا ہی مناسب تھا۔ صرف یہ خلش رفع کرنے کی ضرورت رہتی ہے اور دراصل یہی خلش ایسی ہے جس نے مسلمان، غیر مسلمان، شیعہ، سنی سب کو الجھایا ہے۔ وہ خلش یہ ہے کہ اگرچہ صلح کرنا غلط نہ تھا، صحیح تھا۔ مگر کیا اس کے معنی ہیں کہ امام حسن علیہ السلام نے اس طرح کی صلح کر کے معاویہ کو خلیفہ اللہ بنا دیا یا مانا؟ اور وہ منصب خلافت الہیہ کا مالک ہو گیا؟ اور آیا اس طرح امام حسن علیہ السلام نے معاویہ کو اس کے افعال کو درست اور واجب الاتباع شرعی سمجھ لیا؟ اور آیا امام حسن علیہ السلام امام برحق اور خلیفہ اللہ نہ رہے؟ اور آیا لڑ کر مر جاتے تو یہ بات باقی نہ رہتی؟ یا ایسا نہیں ہے۔ اور سب کا جواب یہ ہے کہ ہرگز معاویہ کی حقیقت ثابت ہوتی ہے نہ معاذ اللہ امام حسنؑ کی امامت و خلافت الہیہ جاتی ہے نہ شیعہ عقائد کی رو سے نہ سنی خیالات کی رو سے، چونکہ اہلسنت کی طرف سے بعض نا فہم یا متعصب لوگوں نے معاویہ کو برحق بنانے کی سعی کی ہے جو قطعی غلط ہے جس کی توضیح آیا چاہتی ہے، اس بنا پر شیعوں کو بھی غصہ آتا ہے اور سنی بھی غلطی میں مبتلا ہوتے ہیں اور غیر مسلم بھی دھوکے میں پڑ جاتے ہیں۔

بہر حال اب ہم اہلسنت کی کتابوں سے امام حسنؑ کی صلح کے متعلق اپنے دعوے کی دلیلیں نقل کرتے ہیں۔

نے یہ بیان کیا ہے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد خلافتِ حتم  
 بن علی علیہما السلام کے ساتھ ساتھ تیس سال حتم ہو گئے۔ یہ حدیث اس  
 بات پر صراحتِ دلالت کرتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خلافت  
 اتنی ہی مدت تک حق تھی، اس کے بعد نہیں۔ بلکہ اس کے بعد ملکِ عضو ہو گیا  
 ابن حجر، عیسیٰ نے صواعقِ محرقہ میں خلافتِ ابی بکر کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ یعنی  
 لوگوں کو اس زمانہ (ملکِ عضو) میں ظلم اور بے انصافی سے سابقہ  
 پڑے گا۔ گویا وہ ایک دوسرے کو کاٹ کھاتے ہوں گے صاحبِ صواعق  
 سے تعجب ہے کہ کتاب کے شروع میں تو حق بات کا اعتراف کیا اور خاتمہ کتاب  
 میں اپنی ہی مخالفت اس طرح کی کہ معاویہ کو خلیفہ حق اور امامِ صدق کہہ دیا۔  
 دراصل فراوشی اور نسیان ہے۔ اور ابن ابی شیبہ نے سعید بن جہان سے  
 روایت کی ہے انھوں نے کہا کہ میں نے سفینہ سے کہا کہ بنی امیہ اسی زعم میں  
 ہیں کہ خلافت ان میں ہے۔ اس پر انھوں نے کہا کہ کربخی آنکھ والے کے جنے  
 جھوٹے ہیں۔ (خلافت سے کیا واسطہ) وہ لوگ بادشاہ ہیں اور بادشاہ  
 بھی نہایت بُرے۔ اور معاویہ سب سے پہلا بادشاہ ہے۔ اور ابن سعید  
 نے عبدالرحمن بن امبری سے انھوں نے عمر سے روایت کی ہے کہ عمر نے کہا  
 ہے کہ جب تک اہل بدر میں کا کوئی بھی باقی رہے گا یہ امر اہل نہیں (بدر والوں)  
 میں رہے گا۔ اس کے بعد اہل احد میں جب تک ان میں کا ایک بھی باقی رہے  
 پھر فلاں پھر فلاں میں لیکن طلیق اور اولادِ طلیق اور مسلمانانِ فتح میں کسی کو  
 اس میں کچھ حق نہیں، کیا اس کے باوجود بھی یہ کہا جاسکتا ہے کہ معاویہ خلیفہ حق

اور امام صدق ہے لاجلہ ولاقوة الا باللہ۔ بھلا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قول ملک عضو اور شریک تو جھوٹا ہو جائے اور معاویہ کے ہوا خواہ اپنے قول خلیفہ حق و امام صدق میں سچے بن جائیں۔ کیا لوگوں سے کتاب کا میثاق نہیں لیا جا چکا ہے کہ وہ لوگ خدا کے مقابلہ میں سوائے حق کے اور کچھ نہیں کہیں گے۔ خدا یا! ہم ایسے اعمال سے بیزار ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ جو کچھ تیرا نبی اور رسول لایا ہے اس کی تصدیق پر ثابت قدم رہیں۔ بعض جھگڑالو لوگوں نے اس طرح انکار کیا ہے کہ حکم واحد کی نسبت حق و باطل کی طرف نہیں دی جاسکتی۔ حالانکہ دونوں باتیں (امام کا حق پر معاویہ کا باطل پر ہونا) متضاد ہیں۔ لیکن اس غبی کو اتنا بھی پتہ نہ چلا کہ دو نسبتیں ہیں تو ضرور مگر جہتیں بدلی ہوئی ہیں۔ پھر ایسی صورت میں کیا خرابی ہے؟ اس کی نظیریں تو بہت کثرت سے اس شخص کو مل سکتی ہیں جس کو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت سے کچھ بھی مس ہو گا۔ دیکھ لو آپ نے کفار مکہ سے حد پیر کے دن ان شروط پر صلح کر لی کہ آپ اور آپ کے اصحاب نہ حج کریں گے نہ عمرہ بجلائیں گے اور مدینہ لوٹ جائیں گے۔ اور اگر کفار میں کا کوئی مسلمان ہو کر آپ کی طرف آجائے گا تو اس کو واپس کر دیں اور آئندہ سال بھی جب مکہ میں آئیں گے تو تین دن سے زیادہ نہ رہ سکیں گے، اور وہ بھی اس طرح کہ (اسلوجنگ ساتھ نہ ہوں گے) صرف وہ سلاح جو مسافروں کے لیے ضروری ہوتے ہیں لاسکیں گے (یعنی نیام کے اندر تلوار) ان تمام باتوں کے باوجود وہ کفلاں اس پر بھی راضی نہ ہوئے کہ محمد رسول اللہ کی لفظ لکھی جائے۔ چنانچہ آپ نے خود اپنے دست مبارک

سے اس لفظ کو مٹا دیا اور اس کو بدل کر محمد بن عبد اللہ بنا دیا گیا، تو کیا صلح سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے حق اور کفار کی طرف سے باطل نہ تھی۔ (ایک جہت سے حق، دوسری جہت سے باطل ہونا معلوم ہو گیا کہ اب بھی نہیں)، اسی طرح کیا نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عینہ اور اقرع سے اس شرط پر صلح نہیں کی تھی کہ اگر یہ دونوں قبیلے واپس چلے جائیں اور ابوسفیان کی اور احزاب کی مدد نہ کریں تو آپ ان لوگوں کو مدینہ کے پھلوں میں سے ایک تہائی دے دیں گے۔ وہ تو سعد نے آپ کو یہ مشورہ دے دیا کہ یا حضرت اگر وحی سے یہ کام ہو رہا ہو تو خیر ورنہ اس صلح کو چختہ نہ فرمائیے۔ اس رائے کو پسند فرما کر آپ نے اس کو چختہ نہ کیا۔ (کیوں صاحب) کیا یہ صلح رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے حق اور دوسری طرف سے باطل نہ تھی (جب فعل رسول کی نظیریں موجود ہیں) تو اسی طرح صلح حسن علیہ السلام بھی آپ کی طرف سے حق اور معاویہ کی طرف سے باطل ثابت ہو گئی۔ الغرض معاویہ کے خطا کار، غاصب اور گنہگار ہونے میں کچھ شبہ نہیں۔ اس پر مزید طرہ یہ کہ معاویہ نے اس صلح میں جن باتوں پر خدا سے عہد کیا تھا ان میں کی اکثر کو توڑ ڈالا، اور خلافت و رذی کی جو آئینہ بیان سے تم پر واضح ہو جائے گا۔ گویا اُس نے خداوند عالم کا یہ قول سنا ہی نہیں کہ چون کہ ان لوگوں نے عہد توڑ ڈالے لہذا ہم نے ان پر لعنت بھیجی کی اور ان کے دلوں کو سخت بھی کر دیا۔ معاویہ نے خداوند عالم کے اس حکم کی کوئی پروا نہ کی کہ جو لوگ میثاق کے بعد عہد خدا کو توڑتے اور جن باتوں کو جوڑنے کا حکم دیا ہے ان کو قطع کرتے ہیں اور زمین

پر فساد پھیلاتے ہیں ان پر لعنت اور ان کے لیے بُرا ٹھکانا ہے۔

اب میں فتح الباری شرح صحیح بخاری اور تاریخ ابو جعفر طبری اور تاریخ کامل ابن اثیر وغیرہ سے صلح کے قصہ کا خلاصہ لکھتا ہوں تاکہ تم کو معلوم ہو جائے کہ امام حسن علیہ السلام کو صلح کی کیا مجبوری ہوئی اور معاویہ کے عہد شکنی کا بھی علم ہو جائے۔ ان لوگوں نے بیان کیا ہے کہ جب لوگوں پر وہ باتیں ظاہر ہو گئیں جو اہل المؤمنین علی علیہ السلام اہل شام کے متعلق ان لوگوں سے بیان کرتے تھے تو چالیس ہزار آدمیوں نے موت پر آپ کی بیعت کی۔ ابھی آپ (مقابلہ کے لیے) جانے کا سامان ہی کر رہے تھے کہ آپ کو قتل کر ڈالا گیا۔ واذا اراد اللہ شیئا فلا مرد له آپ کی شہادت کے بعد جب لوگوں نے امام حسن علیہ السلام کی بیعت کی تو آپ کو یہ اطلاع پہنچی کہ معاویہ اہل شام کو لے کر آپ کی طرف چڑھا آ رہا ہے فوراً آپ نے اسی فوج کو لے کر (جنہوں نے آپ کے والد کی بیعت کی تھی) اور کوفہ سے معاویہ کے مقابلہ کے لیے چلے تھے، جنگ کی تیاری کر دی اور بارہ ہزار آدمیوں کا سردار بنا کر قیس بن سعد بن عبادہ کو بطور مقدمتہ الجیش معین کر دیا۔ جب امام حسنؑ مدائن پہنچے تو کسی نے آپ کے لشکر میں یہ آواز بلند کر دی کہ قیس بن سعد قتل کر ڈالے گئے بھاگ چلو۔ چنانچہ لوگ بھاگنے لگے۔ چنانچہ آپ کے (خیمہ کے) پردہ لے بھاگے، آپ کا اسباب لوٹ لیا۔ یہاں تک کہ جس فرش پر آپ بیٹھے ہوئے تھے وہ بھی کھینچ لے گئے اور خود آپ کے شکم مبارک پر خنجر کا وار کر دیا۔ آپ کو لامحالہ ان لوگوں سے نفرت ہو گئی اور ان کے خطرے محسوس کرنے

لگے اور آخر کار مدائن کے سفید قصر میں داخل ہو گئے۔ اس وقت مدائن کے حاکم سعد بن مسعود نقضی تھے جو مختار بن عبیدہ کے چچا تھے۔ اس وقت مختار جو ابھی نوجوان تھے کہنے لگے کہ (چچا) آپ کو دولت اور شرف کی خواہش ہے انھوں نے پوچھا کیا مطلب؟ انھوں نے کہا حسن کو قبضہ میں کر کے معاویہ کے حوالے کر دیجئے۔ اس پر ان کہے چجانے کہا کہ بھلا تو اسے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر حملہ کر دوں اور انھیں گرفتار کروں تم تو بہت بُرے آدمی ہو۔ اب امام حسن کو یقین ہو گیا کہ دونوں گروہوں میں سے کوئی غالب نہیں ہو سکتا، مگر جب کہ جب زیادہ حصہ قتل ہو جائے۔ آپ نے معاویہ کو لکھا کہ آپ معاویہ کو حکومت حوالے کر سکتے ہیں، بشرطیکہ جو شرطیں آپ کریں اُسے منظور کرے۔ اس پر بعض شرائط میں کچھ دیر سوچ کر سب پر معاویہ راضی ہو گیا۔ اس کے بعد دونوں میں اس طرح صلح طے پائی کہ معاویہ کو مسلمانوں کی حکومت اس شرط سے حوالہ کی جاتی ہے کہ وہ کتابِ خدا، سنتِ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور خلفائے راشدین ہدایتین کی سیرت کے مطابق حکومت کرے۔ معاویہ کو یہ حق نہیں کہ اپنے بعد کسی کو اپنا نائب مقرر کرے بلکہ معاویہ کے بعد حکومت کا فیصلہ مسلمانوں کے مشورہ پر موقوف رکھا جائے۔ تمام لوگ خواہ شام میں ہوں، یمن میں ہوں، خواہ عراق میں ہوں، حجاز میں ہوں، زمینِ خدا پر جہاں ہوں ہر جگہ محفوظ رہیں۔ اصحابِ علیؑ اور آپ کے شیعہ کی جان، مال، اولاد، عورتیں جہاں ہوں محفوظ و مطمئن رہیں گے۔ جو کچھ علیؑ کے زمانے میں ہوا ہے ان میں سے کسی کا مواخذہ ان میں کسی سے نہ ہو گا۔ حسن بن علیؑ اور ان کے

بھائی حسین بن علیؑ اور اہلبیت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں سے کسی کے قتل کی کوئی سازش مخفی یا ظاہر کسی طور سے نہ کی جائے۔ ان میں کا کوئی چاہے کسی افق پر بیٹا ہو خوف زدہ نہ کیا جائے۔ معاویہ ان تمام باتوں کا عہد اور میثاق خداوند عالم سے کرتا ہے اور خدا کی گواہی پس ہے۔ ان باتوں سے ابن اشیر نے اتنا اور زیادہ لکھا ہے کہ معاویہ امام حسنؑ کو وہ رقم جو کوذ کے بیت المال میں ہے اور خراج دار الجرد حوالہ کر دے گا۔ تاکہ اس مال سے ان لوگوں کو راضی رکھا جاسکے جنہیں مال کے سوا اور کوئی چیز راضی نہیں رکھ سکتی، اور یہ کہ علیؑ پر شتم و شتم نہ کیا جائے گا۔ ان سب باتوں پر معاویہ راضی ہو گیا صرف دو باتیں نہیں ماننا تھا۔ ایک تو علیؑ کو برا کہنا، اس میں اتنا ماننا تھا کہ حسنؑ کے سنتے ہوئے شتم نہ کرے گا۔ اور دوسرے یہ کہ دس آدمیوں کو امن نہ ہوگا۔ اس پر امام حسنؑ نے رضامندی نہ دی بلکہ اپنی شرط پر اصرار ہی کیا۔ معاویہ نے آپ کی طرف یہ لکھ بھیجا کہ میں نے قسم کھائی ہے کہ میں جب بھی قیس بن سعد پر قبضہ پاؤں گا ان کی زبان اور ہاتھ کاٹ ڈالوں گا۔ اس پر امام حسنؑ نے یہ فرمایا کہ میں تجھ سے ہرگز معاملہ نہ کروں گا۔ اگر تو قیس یا ان کے علاوہ کسی سے بھی کسی جھوٹی یا بڑی بات کا بدلہ لینا چاہے گا۔ اس پر معاویہ نے ایک سفید کاغذ بھجوادیا اور کہلا بھیجا کہ اس پر آپ جو چاہیں لکھ دیں میں سب کا پابند ہو جاؤں گا۔ اس کے بعد معاویہ نے اس پر عہد

لے جو فارسی میں ہے۔

پر مال خرچ کرنا، وقت پر فوج کشی کرنا، دشمن کے گھر پر چڑھ کر جنگ کرنا۔ کیونکہ اگر دشمن سے اس طرح تم نہ لڑو گے تو وہ تم سے لڑے گا۔ یہ کہہ کر منبر سے اتر آیا۔ اور ابواسحاق بسبی نے اس پر اتنا اور اضافہ کیا ہے کہ معاویہ نے خطبہ میں یہ الفاظ بھی کہے کہ آگاہ ہو جاؤ کہ جو کچھ میں نے حسن سے وعدے کیے ہیں وہ سب میرے ان دونوں پاؤں کے نیچے (ان کو روندنا ہوں)، کسی ایک کی بھی وفادار کروں گا۔ اور عبدالرحمن بن شریک جب اس بات کو بیان کرتے تھے تو کہتے تھے کہ خدا کی قسم اس کو تہنگ کہتے ہیں۔ لوگوں کا بیان ہے کہ جب صلح ہو چکی اور اہل کوفہ بیعت کر چکے تو معاویہ نے امام حسن سے التماس کی کہ مجمع میں تقریر کریں اور لوگوں سے یہ کہیں کہ آپ نے معاویہ کی بیعت کر لی ہے اور حکومت اس کے سپرد کر دی ہے۔ آپ نے منبر پر جانا منظور فرمایا اور بالائے منبر جا کر پہلے حمد و ثنائے الہی بجالائے اور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر صلوات بھیجی اور فرمایا کہ ایہا انہما سب سے زیادہ عقل والا وہ ہے جو خدا سے ڈرے، اور نہایت احمق وہ ہے جو اس کی نافرمانی کرے۔ (کہتے کہتے یہ فرمایا) کہ تم لوگوں کو معلوم ہے کہ خداوند عالم نے تمہاری ہدایت میرے جد (بزرگوار) کے ذریعہ سے فرمائی اور تم کو گمراہی سے انھیں کے ذریعہ بچایا اور جہالت سے چھڑایا، ذلت کے بعد انھیں کے طفیل سے تم کو عزت دی اور قلت کے بعد تم کو کثرت انھیں کے سبب حاصل ہوئی۔ اس میں تو شک ہی نہیں کہ معاویہ نے مجھ سے اس میں نزاع کی جو بالکل میرا ہے، اس کا اس میں کچھ حصہ نہیں۔ تو

میں نے اصلاحِ اُمت اور رفعِ فتنہ کا خیال کیا۔ اور تم لوگ مجھ سے اس شرط پر بیعت کر چکے تھے کہ جس سے میں صلح کروں گا تم بھی صلح کرو گے، جس سے میں جنگ کروں گا تم بھی جنگ کرو گے۔ اب میری رائے یہ ہوئی کہ معاویہ سے صلح کر لوں اور میری اس کی جو لڑائی ہو رہی ہے اُسے موقوف کر دوں۔ چنانچہ میں نے اس سے معاہدہ کر لیا ہے اور طے کر لیا ہے کہ خونِ ریزی کی بہ نسبت خون کو محفوظ کرنا بہتر ہے۔ میرا ارادہ اس سے صرف تم لوگوں کی بھلائی اور تمہاری بقا ہے۔ وان ادری لعلہ فتنۃ لکم و متاع الیٰ حین۔ اور امام حسنؑ نے قیس بن سعد کے پاس جو آپ کے مقصدۃ الجیش پر بارہ ہزار پر سردار تھے، یہ لکھا کہ معاویہ کی طاعت میں داخل ہو جائیں۔ اس پر قیس لوگوں کے سامنے کھڑے ہو گئے اور فرمایا کہ ایہا الناس ایاتو کراہی کے امام کی اطاعت کر لو یا پھر بغیر امام کے ہو کہہ جنگ کرو۔ چنانچہ بعض لوگ کھڑے ہو گئے اور کہا کہ ہم مگر امام کے ماتحت رہنے کو پسند کرتے ہیں۔

— چنانچہ ان لوگوں نے بھی معاویہ کی بیعت کر لی، اور جن

لوگوں نے قیس کا ساتھ دیا ان کے ساتھ قیس لوٹے اور ان کے ساتھ یہ معاہدہ کیا کہ معاویہ سے لڑیں گے یہاں تک کہ معاویہ علیؑ کے شیعوں اور قیس کے کل ساتھیوں کے جان و مال کی حفاظت کی شرط مان لے چنانچہ معاویہ نے ان لوگوں سے اس کا عہد کیا اس طرح آپس میں صلح ہو گئی۔ جب معاویہ کی صلح کا معاملہ مکمل ہو چکا تو اس کے پاس سعد بن ابی وقاص

آئے اور کہا کہ اے بادشاہ! السلام علیک، اس پر معاویہ ہنس دیا اور کہا کہ اے ابواسحاق! اگر تم مجھے امیر المومنین کہتے تو کیا حرج تھا۔ اس پر سعد نے کہا کہ کیا تم مذاق سے نہیں ملکے؟ واقعہ یہ کہ رہے ہو؟ خدا کی قسم جس طرح تم نے حکومت حاصل کی ہے میں تو اس طرح ہونا بھی پسند کرتا۔ اور مغیرہ بن شعبہ کو یہ اطلاع ملی کہ معین بن عبداللہ خروج کا ارادہ رکھتا ہے۔ اس نے کچھ لوگوں کو بھیجا تو اس کے پاس کچھ لوگ موجود تھے۔ بہر حال (معین) گرفتار کر لیا گیا اور قید کر دیا گیا۔ اب مغیرہ نے معاویہ کے پاس اپنا حال کہلا بھیجا۔ معاویہ نے لکھا کہ اگر وہ یہ شہادت دے کہ میں خلیفہ ہوں تو چھوڑ دے۔ مغیرہ نے اس کو حاضر کیا اور کہا کہ تم گو اہی دیتے ہو کہ معاویہ، خلیفہ اور امیر المومنین ہے؟ معین نے کہا، میں گو اہی دیتا ہوں کہ خداوند عالم برحق ہے اور قیامت کا دن حق ہے، وہ آکے رہے گی، اور یہ بھی حق ہے کہ خدا ان لوگوں کو زندہ کرے گا جو مر چکے ہیں۔ اس پر مغیرہ نے حکم دیا اور معین قتل کر ڈالے گئے (کامل کی عبارت ختم ہوئی)۔ اور ابن عبدالبر نے ابوبکرہ سے روایت کی ہے اس نے بیان کیا کہ میں اپنے باپ کے ساتھ معاویہ کے پاس گیا۔ چونکہ ہم کو ابالیان زیاد نے بھیجا تھا، جب ہم وہاں پہنچے تو معاویہ نے کہا کہ اے ابوبکرہ! کوئی حدیث بیان کرو۔ تو انھوں نے کہا کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے کہ آپ فرماتے تھے، خلافت تیس سال ہوگی، پھر ملک ہو جائے گا۔ یہ سنئے ہی ہمارے متعلق معاویہ نے نکال دینے کا حکم دیا۔ چنانچہ ہماری پشت پر زخم لگا کہ ہم کو باہر نکلوا دیا گیا۔

معاویہ اور امام حسنؑ کی صلح کا یہ خلاصہ ہے۔ اس سے اچھی طرح آشکار ہے کہ معاویہ گمراہی کا امام ہے جیسا کہ قیس بن سعد نے کہا، اور یہ بھی متیقن ہو گیا کہ معاویہ بادشاہ تھا اور نہایت بُرا بادشاہ، جیسا کہ سعد و سفینہ نے کہا۔ اور اس میں بھی کچھ شک نہ رہا کہ معاویہ بدعتی تھا اور بزرگ شمشیر (حکومت کا) غاصب تھا۔ اس نے رضامندی اور مشاورت سے ہرگز حکومت حاصل نہ کی کہ حق ہوتی، بلکہ وہ تو شتم علیؑ کو حلال اور قیس کی زبان کاٹنے اور فلاں، فلاں کے قتل کے بغیر صلح تک منظور نہیں کر رہا تھا، اس کے علاوہ اس کے بعد اس نے کتنی بدعتیں کیں، دین میں کتنے تغیر و تبدل کیے اور یہ کل باتیں خدا کے نزدیک ناپسندیدہ گناہ تھیں۔ اب (کوئی بتلائے کہ) کہاں ہے وہ حقیقت جس کا ادعا معاویہ کے انصار کرتے ہیں جن کی غرض سوائے اپنی رائے کی تائید اور اپنی ٹوٹی کی بے جا طرف داری کے سوا کچھ نہیں۔ کاش یہ لوگ اللہ سچ کہتے تو ان کے لیے بہتر ہوتا۔ خداوند عالم ہم کو اس بلا سے محفوظ رکھے جس میں یہ لوگ مبتلا ہوئے اور جب تک ہم زندہ رہیں، ہمیں حق اور گروہ حق کا ہمنوا رکھے۔

معاویہ کے بعض ہوا خواہوں کا یہ زعم ہے کہ صلح حسنؑ کے بعد امت کا معاویہ پر اجتماع، اس کے معنی یہ ہونے کہ امت کا اجماع ہو گیا اور اجماع حجت ہے۔ لیکن یہ منالطہ اور زری دھاندلی ہے۔ یاد رکھو، اجماع اور ہے اور اجتماع اور ہے۔ اجماع کے تو معنی جیسا کہ اصولیین نے بیان کیے ہیں یہ ہیں کہ امت کے کل مجتہدین کا کسی امر پر اتفاق کرنا جس پر کتاب یا سنت سے کوئی دلیل بھی ہو جو اجتماع کرنے والوں کا مستند ہو۔ اب غور کرو کہ یہاں

پر معاویہ کی ولایت کی حقیقت پر کون سی دلیل ہے اور کس مجتہد نے اس کی  
 تصریح کی ہے۔ البتہ (جب مہل ہی کہنا ہے تو) کسی کا دل گوارہ کرے تو یہ کہہ  
 عمرو، میسرہ، زیاد اور ازیں قبیل کے لوگ جن کو دین سے نہ کوئی واسطہ تھا،  
 نہ بہرہ۔ (یہ تھے مجتہدین، تو اس کے دین کا کیا کہنا، سبحان اللہ) لیکن اہل علم  
 و فضل و دین تو ان میں سے اکثر نے تصریح کر دی ہے۔ جیسا کہ بیان کر چکا  
 کہ معاویہ بزرگ شمشیر غالب آیا تھا اور ناحق اس پر حملہ آور ہوا تھا اور اپنی  
 بیعت پر کثیر تعداد لوگوں پر جبر کیا تھا اور کتنوں پر کیسے کیسے سخت تم کیے  
 اور کتنوں کو قتل کر ڈالا۔ جن لوگوں نے بیعت سے انکار کیا، ہاں اگر یہ کہو  
 کہ اس پر ناحق اجتماع ہوا تو یہ ماننا ہوں۔ واقعہ ہے جس کی خبر رسول اللہ  
 صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان پیشین گوئیوں کے ضمن میں دے گئے تھے جو فتنے  
 آپ کی امت کو پہننے ہوں گے۔ ملاحظہ ہو نعیم بن حماد نے فتن میں سفیان سے  
 روایت کی ہے انھوں نے کہا کہ میں امام حسن کے پاس آپ کے بیٹے واپس  
 ہونے کے بعد حاضر ہوا، اور میں نے کہا کہ اے نذل المؤمنین! اس کے خلفا  
 جو دیلیں امام حسن نے میرے سامنے پیش کیں منجملہ ان کے ایک یہ بھی تھی،  
 فرمایا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے، کچھ دن نہ گزرنے  
 پائیں گے کہ اس امت کی حکومت ایک ایسے شخص کے لینے جمع ہو جائے گی  
 جو جوڑے حلق والا ہوگا، کھاتا جائے گا مگر سیر نہ ہوگا، وہ معاویہ ہے۔  
 اس وقت میں نے کہا کہ بے شک امر خدا ہو کے رہتا ہے۔ اور ابو نعیم نے  
 عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے، انھوں نے فرمایا کہ جب

تم دیکھنا کہ شام کی حکومت ابن ابوسفیان کے لیے پوری ہو گئی تو مکہ بھاگ آنا۔ لوگوں کا اُس پر اجتماع ہو گا۔ درآخالیکہ ان میں سے اکثر مجبور ہوں گے، اس کو معذرت نہیں بنا سکتا اور اس کے عذاب میں کوئی کمی نہیں کر سکتا۔ اگر ہم معاویہ کے ہوا خواہوں کا یہ زعم کہ کل لوگ اس کے مطیع تھے مجادلہ کے طور پر فرض بھی کر لیں اور یہ کہ وہ قرشی تھا اور اس کی امامت ظاہر کر جائز ہو سکتی ہے، تو بھی یہ تو معلوم ہو کہ وہ رحمت، وہ عدل، وہ وفا جس کی شرط الاثمۃ من قریش والی حدیث میں کی گئی۔ وہ بھی اس حد تک کہ اگر ان سے کسی ایک شرط کو کوئی پورا نہ کرے تو اس پر خدا فرشتے اور تمام انسانوں کی لعنت واجب ہوتی ہے۔ وہ کہاں ہے۔ رحمت سے کیا واسطہ وہ تو لوگوں کو نہ ہر دے دے کہ قتل کرتا تھا، بے گناہ قتل کرتا تھا، لوگوں کے گھر گر دیتا تھا، لوگوں کو جلا وطن کر دیتا، لوگوں پر ظالموں کو مسلط کرتا تھا۔ جو اُن پر بُرے بُرے عذاب کیا کرتا تھا اُسے عدل سے کیا واسطہ؟ جو بجائے فراش کے زانی کو اس کا لٹکا دلاتا تھا، چاندی سونا اپنے واسطے مخصوص کر لیا تھا۔ مسلمانوں کا مال خوب اسراف کے ساتھ اپنی خواہش نفسانی کے مطابق تباہ کرتا تھا۔ ناحق ہی حاصل کرتا تھا اور ناحق ہی خرچ کرتا تھا، اس کو وفا سے کیا واسطہ؟ حالانکہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ بیان فرمادیا تھا کہ وہ اور عمر و عاص عذر پر اتفاق کریں گے، اور علی کہ تم اللہ و جہا نے فرمایا ہے وہ (معاویہ) عذر کرتا ہے اور ناجز ہے۔ اگر اس کا کوئی اور عذر

نہ بھی ہوتا تو اس کی ایک یہی بد عہدی کافی ہے جو اس نے امام حسن بن علی  
 علیہم السلام کے معاہدہ کے باب میں کی۔ اسے طالب حق! تم حدیث مذکور  
 کے پورے متن پر جھے رہو۔ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے  
 ائمہ قریش سے ہوں گے، ان کا حق تم پر ہوگا، تمہارا حق ان پر ہوگا۔ اگر  
 ان سے درخواستِ رحم کی جائے گی وہ رحم کریں گے، اگر ان کے پاس  
 مقدمہ جائے گا تو وہ عدل کا فیصلہ کریں گے۔ اگر وہ کوئی عہد کریں گے  
 تو وہ اس کی پابندی کریں گے۔ اگر کوئی اس کے خلاف کرے تو اس  
 پر خدا کی لعنت، ملائکہ کی لعنت، اور کل انسانوں کی لعنت۔ ایسے شخص  
 کا فریضہ اور نافعہ خدا کچھ نہ قبول کرے گا۔ اس حدیث کے بہت سے  
 طرق ہیں، جن کو حافظ ابن حجر نے ایک کتاب میں جمع کیا ہے، جس کا نام  
 "لذة العيش في طرق حدیث الاثمة من قریش" رکھا ہے۔  
 مسعودی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ بیان کیا منصور بن وحشی نے،  
 ان سے ابو الفیاض عبد اللہ بن محمد البہاشمی نے، ان سے ولید بن بحری  
 عبسی نے، ان سے حرث بن سمار البہرانی نے کہ معاویہ نے صعصعہ بن  
 صوحان الجندی کو اور عبد اللہ بن الکوثر البشکری کو، اور کچھ لوگ جو  
 اصحاب علیؑ سے تھے ان کو کچھ قریش کے لوگوں کو قید کر دیا۔ اس کے  
 بعد معاویہ ان کے پاس گیا اور کہا کہ میں تم لوگوں کو خدا کی قسم دے کر  
 پوچھتا ہوں، تم لوگ حق اور صدق کہو کہ تم لوگوں نے مجھے کیا خلیفہ پایا۔  
 اس پر ابن الکوثر نے کہا کہ اگر تم نے قسم نہ دے دی ہوتی تو میں ہرگز

نہ بولتا کیونکہ تم جبار عنید ہو، نیکو کاروں کو قتل کرتے ہو، اور اللہ سے ذرا نہیں ڈرتے لیکن اب تو ہم کو کہنا ہے۔ جہاں تک ہم کو علم ہے تیری دنیا تو بڑی وسیع ہے لیکن تیری آخرت بڑی تنگ ہے۔

اندھیرے کو روشنی اور روشنی کو اندھیرا بنا دیتا ہے

اس کے بعد صعصعہ نے گفتگو شروع کی اور فرمایا کہ اے ابن سفیان! جو کہنا تھا کہہ ڈالا، اور جو تیرا ارادہ تھا پورا ہو گیا۔ لیکن جیسا تو نے کہا ویسا واقعہ نہیں ہے۔ وہ کیوں کہ خلیفہ ہو سکتا ہے جو لوگوں پر قہر بادشاہ بن بیٹھا ہو اور ان کو تکبر سے روند ڈالا ہو، اور جو لوگوں کا حاکم جھوٹ اور اسباب باطل اور مکہ سے بن گیا ہو۔ کان کھول کر سن لے کہ نہ تو بدر میں تو نے کوئی خدمت کی، بلکہ اُلٹے تو اور تیرا باپ اسلام کے مخالف لشکر اور بھڑکانے والے لوگوں میں تھے۔ جن لوگوں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف لشکر جمع کیا۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ تو طلیق ابن طلیق ہے تم دونوں کو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آزاد کیا تھا۔ تو بھلا آزاد کردہ خلافت کی صلاحیت کیوں کر رکھ سکتا ہے۔ اس پر معاویہ بول اٹھا کہ اگر میں ابو طالب کے قول کی طرف متوجہ نہ ہوتا کہ :

قابلت جملہم حلما ومغفرة

والعفوعن قدرة ضرب من الکرمة

میں نے ان لوگوں کے جہل کا مقابلہ حلم اور مغفرت سے کیا،

اور قدرت کے باوجود معاف کر دینا کرم کی ایک قسم ہے۔ (تو میں تم سب کو قتل کر ڈالتا)۔

میں کہتا ہوں کہ اس سرکش گمراہ نے جو ان لوگوں کو اس وقت قتل نہ کیا تو نہ اس لیے کہ اُسے مستقیم جبار کا خوف یا ورود فی النار سے ڈر تھا۔ بلکہ محض اس لیے قتل نہ کیا جیسا کہ اس نے خود ہی ظاہر بھی کر دیا کہ اس طرح لوگ اس کو حلیم و کریم کہیں۔ چنانچہ اس کے ہوا خواہوں نے اس کی یہ خواہش پوری بھی کر دی۔ بلکہ اس پر بھی انہوں نے ایسا اضافہ کر دیا جس سے باطل کی آنکھیں ٹھنڈی ہوئیں۔ اس طرح ان لوگوں نے حق کا چہرہ بگاڑ دیا اور ظلم و زور کے پتے لگا دیے۔“

صاحبِ نصائح کا فیہ کی اس عبارت کے بعد کسی مزید تشریح کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ — تنقیح طلب امور خود بخود حل ہو گئے۔ صلح کرنا صحیح تھا واضح ہو گیا۔ اس صلح سے ہرگز معاویہ کی خلافت کی صحت نہ نکل سکی۔ وہ خلافت الہیہ کا مالک نہ بن سکا۔ (یعنی بنجیال اہلسنت و بسنی خلافت کا مالک نہ ہوا، جیسی وہ خلفاء ثلاثہ کے لیے مانتے ہیں۔ شیعوں کی سی خلافت الہیہ کا تو ذکر ہی نہیں)۔ امام حسن نے ہرگز اس کے افعال کو واجب الاطاعت نہ مانا، بلکہ بالکل واضح ہوا کہ جو کچھ امام حسن کی طرف سے ہوا حق، اور جو معاویہ کی طرف سے ہوا باطل۔ اب اس صلح سے سُنیت کے اعتبار سے بھی معاویہ کو کوئی فائدہ یا امام حسن کو کوئی ضرر نہیں پہنچتا۔

جہاد اور صلح کی شرعی حیثیت سنی مذہب کے اعتبار سے:

کتاب عین الہدایہ جلد دوم ص ۴۳۵ نو لکھنؤ پریس ۱۳۱۳ھ، کتاب السیر

باب الموازنہ کی عبارت ذیل اس موقع پر قابل ملاحظہ ہے :

”اگر امام کی رائے ہو کہ اہل حرب اور ان میں سے کسی فریق سے صلح کرے اور اس میں مسلمانوں کے لیے مصلحت ہو تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ خداوند عالم نے فرمایا ہے کہ اگر وہ لوگ صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی مائل ہو جاؤ اور اللہ پر بھروسہ رکھو۔ اور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اہل مکہ سے حدیبیہ والے سال صلح کی تاکہ اپنے اور کفار کے درمیان لڑائی کو روک دیں دس سال کے لیے اور اس لیے بھی کہ صلح معنی کے اعتبار سے جہاد ہی ہے جب کہ اس میں مسلمانوں کے لیے بھلائی ہو لہذا المقصود ہودفع الشر حاصل بہ کیونکہ اصل مقصود دفع شر ہے اور وہ اس صورت میں حاصل ہو جاتا ہے۔“

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ :

”اگر امام اہل حرب سے مال لے کر صلح کرنے کی رائے رکھتا ہو تو اس میں

بھی کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ جب بغیر مال کے صلح جائز ہے تو مال لے کے بھی جائز ہوگی۔“

بڑے تعجب و افسوس کی بات ہے کہ کفار سے صلح تو جائز ہو اور صلح کے بعد

مسلمان اپنی جگہ پر مسلمان اور برحق باقی رہیں اور کفار اپنی جگہ پر ناحق باقی رہیں اور

صلح کے کرنے نہ کرنے کا فیصلہ امام کی رائے پر ہو۔ لیکن مولفہ القلوب کے مقابلہ

میں یا صلح ناجائز ہو جائے یا جائز ہو تو پھر امام ثابت تو ناحق پر ہو جائے اور جانب

مخالف امام حق بن جائے۔

ت

www.ziaraat.com  
Sabeel-e-Sakina